عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی !!

اِدارۂ اشرفیہ عزیزیہ کا ترجمان

ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ و محرم ۱۴۳۴ھ/نومبر و دسمبر ۲۰۱۲ء

RegNo.P476

جلد: یازدھم
شمارہ: 3,4

فہرست

فی شمارہ: 15/- روپے

سالانہ بدل اشتراک: 200/- روپے

ملنے کا پتہ: پوسٹ آفس بکس نمبر 1015، یونیورسٹی کیمپس، پشاور۔

ای۔میل: physiologist72@hotmail.com

saqipak99@gmail.com

www.darwaish.org

مجالس سلیمانی (قسط۔۳)

(انجینئر ثاقب علی خان صاحب۔ امریکہ)

مندرجہ ذیل موضوعات حضرت مولانا محمد اشرف صاحب سلیمانیؒ نے اپنی عصر کی مجالس میں بیان فرمائے ہیں۔ یہ کیسٹوں سے مرتب کر کے بندہ نے لکھے ہیں۔ (ثاقب علی خان)

سوال ۱: کیا عیسائیت اور اسلام سائنس کے خلاف نہیں؟

سوال ۲: اسلام پہلے پیدا ہوا یا زمین؟

سوال ۳: ستتہ ایام 6 دن سے کیا مُراد ہے؟

جواب: ہمارے نزدیک جہاں تک عیسائیت کا تعلق ہے جو عیسائیت یورپ میں عیسائیت کے نام سے جاری ہے۔ وہ حقیقت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نہیں۔ سینٹ پال کی سالوسیت ہے۔ جو موجودہ عیسائیت ہے یہ سینٹ پال کی ہے جو یہودی تھا۔ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ عیسائیت سائنس کی مخالف تھی۔ جس کی بناء پر نشاۃ ثانیہ Reniance کے دور میں سائنس دانوں پر ظلم کئے گئے۔ ان کے عقائد کو چرچ کے خلاف سمجھا گیا۔ جب سائنسدان قوت میں آگئے۔ تو چرچ میں تبدیلی کی کوشش کی جو Reformation نام سے موسوم ہے۔ اس لحاظ سے ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر عیسائیت یہ دعویٰ کرتی ہے کہ اس میں سائنس کی اجازت تھی تو اناجیل اربعہ میں کوئی ایسا اشارہ نہیں ملتا جس میں یہ پایا جائے کہ اس میں تسخیر کائنات کا تذکرہ ہے۔ جس وقت آپ یہ ثابت کرنا چاہیں تو آپ عیسائیت سے ایسی چیز کو ثابت کریں گے جو عیسائیت کے خلاف ہو۔ اور اگر مدعا یہ ہے کہ بائبل میں تخلیق آسمان اور زمین کے متعلق جو دعوے کئے گئے ہیں وہ سائنس کے مطابق ہیں تو یہ بات ایسے نہیں ہے بلکہ محرف (تبدیل

شدہ) انجیل کے افکار کا سائنس کے ساتھ ٹکراؤ ہی اُس کے صحیح حال میں آسمانی موقف کو کمزور کر رہا ہے۔

اسلام پر ہم دو رُخوں سے بحث کریں گے۔ ہمارے ہاں ادیان سماوی (آسمانی مذہب) اور آسمانی کتابوں کا موضوع ہدایت ہوتا ہے نہ کہ کائنات کی تخلیق کی سائنسی بحثیں۔ اشیاء کے جوڑ توڑ کے متعلق تفصیلات اور قطع برید کے متعلق ہدایات ضمنی ہوتی ہیں۔ اگر قرآن کریم یا انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں تخلیق کے بارے میں کسی چیز کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو وہ خالق کے ثبوت، ہدایت کے اثبات اور ہدایت کے متعلقات کے بارے میں شواہد اور دلائل کی حیثیت سے اور انسانوں کو کائنات کی طرف متوجہ کر کے خالقِ کائنات کی طرف خیال کو پھیرنے کے لئے کرتے ہیں۔ بنے ہوئے کو بتا کر بنانے والے پر استدلال کرتے ہیں۔ قرآن کریم کی آیات پر غور کر کے یہ بات بخوبی واضح ہو جائے گی کہ ان آیات کا مقصد اثبات قیامت اور اثبات الٰہی ہے۔ اصلاً کائنات کی تخلیق اور اس کے تفصیلات کے بارے میں کتب سماوی کا جو طرز عمل ہوتا ہے وہ ہدایت یابی کے لئے ہوتا ہے نہ کہ دُنیاوی چیزوں سے اصلاً استفادہ کے لئے۔ دوسری بات جو ہے کہ ہم نے یہ دیکھ لیا کہ تخلیق کائنات کے بارے میں کتب سماوی کا طرز عمل محض ہدایت انسانی ہوتی ہے۔ تو یہ بات ثابت ہوگئی کہ قرآن کریم میں ہم کو تکوینیات (کائنات کی مادی چیزوں) کے جوڑ توڑ کے اسرار کو تلاش نہیں کرنے چاہیئے۔ یہ دوسری چیز ثانوی حیثیت سے آتی ہے۔ ایک چیز یہ ہے کہ سائنس کی ایجادات کو کتب سماوی میں تلاش کی جائے۔ کائنات اور سائنس کا مسخر کرنا توڑنا اور جوڑنا ایک چیز سے دوسری چیز کو بنانا سائنس کا دائرہ عمل ہے۔ اس کی اجازت قرآن کریم اور کتب سماوی نے دی ہے یا نہیں۔ تو ہم کُھل کر کہہ سکتے ہیں۔ عیسائیت،

یہودیت، ہندوازم، مجوسیت، کنفیوشس اور سوشلزم کی تعلیمات کے برعکس اسلام نے سائنس کی ایجادات یا سائنس والی چیزوں پر کوئی داروگیر (مخالفت) نہیں کی بلکہ حوصلہ افزائی کی ہے۔ قرآن کی متعدد آیات میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

سخر لکم ما فی السمٰوات والارض

یعنی ہم نے جو کچھ زمین و اسمان میں ہے تمہارا تابعدار کردیا ہے

تسخیر کائنات کو ہم دوسرا نام سائنس دے سکتے ہیں۔

اسلام بے خدا سائنس کا قائل نہیں بلکہ باخدا سائنس کا قائل ہے۔ اسلام کافر سائنس کو نہیں چاہتا بلکہ مسلم سائنس کو چاہتا ہے۔ سائنس انکارِ خداوندی کا ذریعہ نہ بنے بلکہ ہر ایجاد خدا کی معرفت کا ذریعہ ہو۔ اگر آپ سائنس کا تجزیہ کریں گے تو یہ بات معلوم ہوگی کہ سائنس کا اصل موضوع صفات اشیاء کو جاننا ہے۔ مختلف اشیاء کے آپس کے جوڑ توڑ اور مختلف اشیاء کی صفات کے ملاپ سے نئی چیز کو وجود میں لانا یا پُرانی صفات کی حقیقت کو دریافت کرنا ہے۔ اگر تجربہ کریں گے۔ تو کوئی نئی چیز وجود میں آئے گی۔ اسلام کے نزدیک جملہ اشیاء کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ آپ اگر کسی چیز کی صفت کو جانتے ہیں تو یہ علم آپ کا ذاتی نہیں ہے بلکہ عطائی ہے۔ ذرہ (Atom) کے جگر میں نظام شمسی کی طرح نظام (Orbit) کس نے بنایا کیونکر بنایا؟ کُھلی بات ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی صنعت گری ہے۔

صنع الذی اتقن کل شیئ

کاریگری ہے اس پرودگار کی جس نے ہر چیز کو کمال کاریگری کے ساتھ بنایا۔ ہر ایک چیز بلکہ ایک ایک بال تک خدا کی قدرت پر دلالت کرتا ہے۔ آپ کے بال کالے ہوتے ہیں کچھ عرصہ کے بعد سفید ہوجاتے ہیں۔ یہ کیوں ہوتے ہیں؟ آپ

اپنے دماغ پرغور کریں، ناک پرغور کریں، جسم کے کسی حصہ کو دیکھیں اس کی باریکیوں پرنگاہ ڈالیں۔ ہرعضو کا ایک کام نہیں ہے۔ایک کام تو خاص ہوتا ہے۔اس کے ساتھ ضمنی کام بھی ہوتے ہیں۔ زبان بات کرتی ہے، مزہ بھی چکھتی ہے۔ تصور کی طاقت اضافی ہے۔اوراس سے جسم پر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔نفرت کا پورا علم تصور پر ہے یہ سب کاریگری ہے اُس کاریگر کی۔ جب آپ سائنس کے تجربات میں مشغول ہوں۔ تو ہرایجاد خدا کی معرفت بڑھائے گی۔اورانسان بے اختیار پکار اُٹھے گا۔

تبارک اللہ احسن الخالقین

اسلام نے انسان کو سائنس سے روکا نہیں لیکن سائنس کا زیادہ زور آج کل تباہ کاری اور تعیش کے خاکوں پر صرف ہورہا ہے۔انسان کی بُنیادی ضرورت پر کما حقہ نہیں خرچ ہورہا ہے۔ Science for War، Science for Piece کی بُنیادی ضروریات کو مہیا نہیں کر رہا۔ اسلام ایک ایسا Co-ordinating Factor ہے جو ہر چیز کو اعتدال پر لاتا ہے اور ہر چیز کو اپنی جگہ پر لاتا ہے۔اسلام سائنس کی اجازت دیتا ہے حدود کے اندر۔ حدود یہ ہیں کہ انسان کے فائدے کے لئے استعمال ہو اور خدا کی معرفت بڑھائے۔اسلام سورج چاند کو مسخر کرنے سے نہیں روکتا۔

؎ سبق ملا ہے یہ معراج مصطفٰے سے مُجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں (گردوں: آسمان)

سائنس انسانی تجربات کا حاصل ہوتا ہے اور انسان کا علم کامل نہیں۔ دنیائی علم میں بھی بتدریج ترقی ہوتی ہے۔سائنس کے وہ اصول اور مبادیات جن کو ہم آج حق سمجھ رہے ہیں، کل غلط ثابت ہو سکتے ہیں۔اگر ہم سائنسی علوم کو سماوی علوم کے تابع

کر دیں جو حقیقت ہیں جبکہ سائنس ظن ہے تو اس ظن کو ہم حقیقت کے تابع کر رہے ہیں۔ جن طبقات نے سائنسی علوم اور اکتشافات کو اصل قرار دیا اور خدائی علوم کو ان کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی تو ٹھوکر کھائی۔ سرسید نے نیچر (Nature) کو اصل جانا۔ اور دین کو نیچر بنانے کی کوشش کی تو اس نے جو نظریات پیش کیے تھے وہ غلط ثابت ہوئے۔ دین ایک اٹل حقیقت ہے جس میں تغیر و تبدل نہیں اور سائنس میں رات دن تغیرات آتے رہتے ہیں۔ سائنس کی آج کی Theory کل غلط ثابت ہو سکتی ہے۔ دین خدا کی طرف سے آتا ہے اس لئے اس میں تبدل نہیں آتا۔ جو طبقات سائنس کو اصل سمجھ کر اس کے مطابق دین کی تاویل کرتے ہیں وہ حقیقت میں دین کی تحریف کر رہے ہیں۔ ان کے نتائج فکر زیادہ سے زیادہ اس زمانے کے کچھ لوگوں کو متاثر کریں گے۔ خصوصاً اس زمانہ میں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۹۴۴ میں Atomic Age شروع ہوتی ہے۔ اور ۱۹۵۸ میں Space Age اور Moon Age شروع ہو جاتی ہے۔ اگر ہم دین کو ان سائنسی انکشافات کے تابع کریں گے تو دین کھلونا بن جائے گا۔ دین ایک اٹل حقیقت ہے اور سائنس ایک ادلتا بدلتا مجموعہ ہے۔ آج سے ۸۰ سال پہلے سرسید اور ان کے رفقاء نے ہندوستان میں اور طنطاوی نے مصر میں نیچر جس سے مُراد سائنس کے اصول و مبادیات تھے کو اصل قرار دیا۔ اور اس زمانہ کی جتنی سائنس ان کے علم میں تھی اس کے مطابق قرآن و سنت کو پرکھا۔ جو چیز موافق تھی اس کے قائل ہوئے اور جو مخالف تھی اس کا انکار کیا۔ سرسید کی پوری تفسیر اور عنایت اللہ خان مشرقی کا تذکرہ ان غلطیوں سے بھرپور ہے۔ برق کا دو قرآن اور دو اسلام ان کی خوشہ چینی ہے۔ یہ وہ غلطی ہے جس کی بناہ پر انسان دین کو نقصان پہنچاتا ہے۔ عنایت اللہ خان مشرقی نے کچھ طنطاوی سے لیا ہے اور کچھ سرسید سے اور برق کی

تو علمیت ہی نہیں تھی ۔ اس بنا پر ہم یوں کہیں گے کہ سائنسی علوم کا دائرہ علیٰحدہ رکھ لیجئے اور اس پر دین کے اصول و مبادی کو نہ پرکھیں ۔ سائنس کا الگ میدان ہے اور دین کا الگ میدان ہے ۔ اگر کوئی شخص کھانا پکانا چاہتا ہے تو اس کے الگ اصول ہیں اور لوہے سے چیزوں کے بنانے کے الگ اصول ہیں ۔ انسان کے علوم کا دائرہ الگ ہے اور خالق کے علوم کا دائرہ الگ ہے ۔ خالق اور مخلوق کے علوم برابر نہیں ہو سکتے ۔ سائنس کے جملہ علوم فطرت انسانی میں ودیعت کئے گئے ہیں اور وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتے رہیں گے ۔ قرآن کریم نے آدم کی پیدائش کے وقت اشارہ کیا ہے ۔

علم ادم الاسماء کلھا

تمام چیزوں کے خواص اور علوم آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے سکھائے اور ان علوم کو فطرت انسانی کے اندر رکھا ۔ جو بھی اس پر محنت کرے گا اللہ تعالیٰ ان کے لئے راستے کھولیں گے ۔ آپ اگر History of inventions کتاب پڑھیں تو آپ کو یہ پتہ چلے گا کہ ابتدائی طور پر معمولی تجربوں سے یہ چیز حاصل ہو گئی تھی ۔ پیالی کیسے بنی؟ گیلی مٹی کو زمین پر پھینکا، اس میں گڑھا سا بن گیا، وہ سوکھ گیا ۔ پھر اس میں پانی ڈالا اور پانی اس میں کھڑا ہو گیا ۔ قرآن نے قابیل کے ہابیل کو قتل کرنے کے قصہ میں مثال دی ہے کہ انسان کو تو یہ پتہ بھی نہیں تھا کہ لاش کو کیسے دفن کیا جاتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے دو کوے بھیجے ۔ ایک کوے نے دوسرے کو مارا ۔ پھر چونچ اور پنجوں سے زمین کھودی اور اس میں مردہ کوّے کی لاش کو دفن کیا ۔ اس سے اندازہ ہوا کہ یہ علم فطرت انسانی میں ودیعت کیا گیا ہے ۔ اور جو علم ہدایت ہے وہ اللہ تعالیٰ سے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے آتا ہے جو حقیقی ہے ۔ قرآن کی سب سے پہلی وحی جو حضور ﷺ پر نازل ہوئی ۔ وہ بھی علم کی

اہمیت کے متعلق ہے۔

اقرا باسم ربک الذی خلق o خلق الانسان من علق o اقرا و ربک الاکرم o الذی علم بالقلم o علم الانسان ما لم یعلم o

(علق: ۱ تا ۵)

ترجمہ: پڑھ اپنے رب کے نام سے جو سب کا بنانے والا ہے۔ بنایا آدمی کو جمے ہوئے لہو سے، پڑھ اور تیرا رب بڑا اکریم ہے۔ جس نے علم سکھایا قلم سے، سکھلایا آدمی کو جو وہ نہ جانتا تھا۔ (معارف القرآن)

انسان کو وہ علم سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ جو فطرت انسان میں ودیعت نہیں کیا گیا تھا بلکہ اوپر سے آیا تھا۔ انسانی علوم جس کا تعلق مادہ کے ساتھ ہوگا وہ تجربہ کی بنیاد پر حاصل ہوں گے۔ انسان کا جسم مادی ہے اور یہ علوم بھی مادی ہیں۔ روح اوپر سے آئی ہے یہ اللہ تعالیٰ کا امر ہے۔ روح کی پرورش اور تربیت کے علوم بھی اوپر سے آئیں گے۔ اسلام سائنس کا قطعاً منکر نہیں ہے بلکہ اسلام سائنس کو صحیح راہ پر لگاتا ہے۔ آپ نے پوچھا ستۃ ایام سے کیا مُراد ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ زمین و آسمان بنے ہی نہیں تھے۔ چاند کا دن اور ہوگا، مریخ کا دن اور ہوگا۔ اس نظام شمسی کے دائرہ سے نکلے تو وہاں دن اور ہوگا۔ بعض کہکشاں Galaxies ایسی ہیں کہ جن کی روشنی کئی لاکھ نوری سال میں پہنچتی ہے۔ ان کے دن کس رُخ سے ہوں گے۔ ستۃ ایام سے مُراد دو باتیں ہوسکتی ہیں۔ یا تو یہ چھ دن اس عالم کے حساب سے ہیں یا اس تخلیق کو چھ مراحل میں مکمل کیا اور چھ مراحل کی حکمت اللہ تعالیٰ خود جانے۔ اس سے مُراد ہم ڈارون کے نظریات نہیں لیں گے۔ ڈارون نے جو Ages مقرر کی ہیں اس سے یہ مُراد نہیں کہ اللہ نے بھی ایسا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو دم واحد میں بنا سکتا ہے۔ یہودیوں

کے نظریہ کے مطابق یہ بات نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے چھ دن میں بنایا پھر (نعوذ باللہ) تھک گیا دو دن آرام کیا۔ ہمارے خدا کو تھکاوٹ محسوس نہیں ہوتی ہے۔ سائنس کا حقیقی موضوع اسلام سے باہر نہیں ہوگا۔ ہمارا علم وہاں تک پہنچے یا نہ پہنچے۔ لوگوں میں مشہور ہے کہ مچھلی پانی میں تھی، مچھلی کے اوپر ایک بیل تھا، اس کے باریک باریک سینگ تھے جس کے اوپر اس بیل نے زمین کو اُٹھایا۔ جب وہ تھک جاتا ہے تو زمین کو دوسرے سینگ پر اُٹھا لیتا ہے جس سے زلزلہ آ جاتا ہے۔ یہ نظریہ ہندوؤں کے کتاب رگ وید کا عطر (آیت) ہے۔ بعض غیر محتاط مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ پہلا آسمان جھالی کا ہے اس کے اوپر دریا ہے۔ جس سے بارش ہوتی ہے۔ حالانکہ قرآن صراحتاً اس کے خلاف ہے۔ قرآن کہتا ہے۔ کہ ہم نے ہواؤں کو بھیجا جو پانی سے لد گئیں (یعنی سمندر کی بخارات کی وجہ سے) پھر اُن کو خشک زمینوں کی طرف ہانکا۔ اسی سے بارش برستی ہے۔ سورج موجود ہے چاند موجود ہے۔ بعض سائنسدان کہتے ہیں کہ آسمان کا وجود ہی نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ نیلی چھت آسمان نہیں۔

؎ بے حجابی نے تری توڑا نگاہوں کا طلسم
ایک ردائے نیلگون کو آسمان سمجھا تھا میں

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

قرآن کے نزدیک جتنی بھی کہکشائیں ہیں۔ ایک ایک کہکشاں میں ہزاروں نظام شمسی ہیں۔

زین السما الدنیا بزنیة الکواکب

زینت سے مُراد یہ نہیں جیسے کسی عورت کے دوپٹے پر سلے ہوئے ستارے

ہیں۔

کل فی فلک یسبحون

ہر ایک اپنی اپنی فضائے بسیط میں تیرتے اور دوڑتے جا رہے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ زمین بھی حرکت کر رہی ہے، سورج بھی، چاند بھی۔ یہ سب اپنے اپنے مستقر کی طرف دوڑ رہے ہیں جو خدا کو معلوم ہے۔ فٹ بال پر 10 چیونٹیاں ہوں۔ تو چیونٹیوں کو فٹ بال کی حرکت کا پتہ نہیں ہوگا۔ ابھی سائنسدانوں کو آسمان پر رسائی نہیں ہے۔ قرآن میں ہے پہلے زمین بنائی گئی پھر آسمان بنایا گیا۔ جہاں کعبۃ اللہ ہے وہاں پانی کا بلبلہ پیدا ہوا۔ وہاں سے زمین پھیلائی گئی۔ بائبل کی کتاب پیدائش کے شروع کے آیتوں میں بھی اسی طرح ہے۔ (جاری ہے)

کھانے کی سنتیں

۱۔ آپ ﷺ نے فرمایا، کھانے سے پہلے بسم اللہ کہو اور ہر ایک اپنے قریب سے کھاؤ۔

(بخاری شریف)

۲۔ جب آدمی گھر میں داخل ہوتا ہے اور اللہ کا نام لیتا ہے اور کھانے پر اللہ کا نام لیتا ہے تو شیطان کہتا ہے، نہ یہاں سونے کی گنجائش ہے نہ کھانے کی۔ (صحیح مسلم)

۳۔ دائیں ہاتھ سے کھانا سنت ہے۔ (بخاری شریف)

۴۔ جو کسی برتن میں کھائے اور اُسے صاف کرے تو برتن اُس کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہے۔ (ابن ماجہ)

۵۔ آپ ﷺ کھانا تین اُنگلیوں سے تناول فرماتے اور جب فارغ ہوتے تو انگلیوں کو چاٹ لیتے۔ (صحیح مسلم) ۶۔ دسترخوان پر گرے ہوئے لقمے کو اُٹھا کر کھانا سنت ہے۔ (صحیح مسلم)

۷۔ کھانے کے بعد ہاتھ دھونا سنت ہے۔ (مشکوٰۃ شریف)

کلیۃالشریعۃ جامعۃ الرشید کراچی کے سالانہ جلسہ تقسیمِ اسناد سے خطاب

(حضرت ڈاکٹر فدا محمد صاحب مدظلہٗ)

خطبۂ ماثورہ۔اما بعد۔

الم نجعل الارض كفاتاo احياءً و امواتاo (مرسلٰت:۲۶،۲۵)

ترجمہ: کیا ہم نے نہیں بنائی زمین سمیٹنے والی، زندوں اور مُردوں کو (معارف القرآن)

و علم آدم اسماء كلها (بقرہ:۳۱)

ترجمہ: سکھلا دیئے اللہ نے آدم کو نام سب چیزوں کے (معارف القرآن)

فاما ياتينكم منى هدىً فمن تبع هداىَ فلا خوف عليهم و لا هم يحزنون (بقرہ:۳۸)

ترجمہ: پھر اگر تم کو پہنچے میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو چلا میری ہدایت پر نہ خوف ہوگا ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (معارف القرآن)

محترم بزرگو اور دوستو! اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانوں کے لئے بنایا ایک نظامِ معیشت اور ایک نظامِ ہدایت۔پہلی آیت جو میں نے پڑھی کہ کیا میں نے زمین کو نہیں بنایا سارے انسانوں کو سمیٹنے والی، زندہ اور مردہ سب کو سمیٹنے والی۔زندہ اور مردہ سارے انسانوں کی جتنی ضرورتیں قیامت تک ہیں اس کے لئے ایک دفعہ زمین کو پیدا کر کے اور اس میں استعداد رکھ کے اللہ پاک نے مکمل نظام دے دیا۔آدم علیہ السلام کو علم دے دیا، استعداد دے دی اس سے فائدہ لینے کی۔جس دور میں جس چیز

کی ضرورت پڑتی ہے انسان غور وفکر کرتا ہے، زمین سے ضرورت پوری ہوتی ہے۔ لکڑی جلا رہا تھا انسان، ختم ہونے کوتھی پر ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ کوئلہ نکل آیا۔ وہ ختم نہیں ہوا تھا کہ اس نے کوشش کی اور پٹرول ر پٹرولیم نکالا۔ میں نے کسی ایٹمی سائنسدان سے پوچھا کہ کیا یہ ممکن ہے کسی وقت ایٹمی توانائی ہمارے ایسے قابو میں آجائے کہ میں اس سے گھر کا چولہا جلاسکوں، پانی گرم کرسکوں، کھانا پکا سکوں؟ اس نے کہا کہ ہاں یہ ممکن ہے، ہوسکتا ہے کسی وقت یہ بات بھی ہو جائے۔ اللہ پاک نے ایک نظام بنایا ہوا ہے کہ اتنی زیادہ آبادی ہو جائے کہ ساری زمین انسانوں سے بھر جائے تو اللہ نے اسمیں اتنی استعداد رکھی ہے کہ زندوں اور مردوں کی ساری ضروریات پوری کرے گی۔ ہمارے حضرت صاحب مولانا اشرف صاحب نے فرمایا کہ انسان چاند پر پہنچنے کا جو دعوہ کرر ہا ہے اور کوشش کرر ہا ہے، اُس سے اسے کوئی چیز ایسی نہیں ملی جو اس کی ضرورت کی ہو یا اس کے کام کی ہو۔

دوسرا نظام اللہ پاک کا ہدایت کا نظام ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا کہ میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آتی رہے گی۔ جس نے اس کا اتباع کیا تو اس کو ایسی کامیاب زندگی ملے گی کہ غم اور خوف سے اس کو نجات مل جائے گی۔ آج کے انسان کا علم **علم الآدم اسماء کلھا** والا ہے۔ یہ مادی وسائل کے بارے میں اس کا علم ہے۔ اور دوسرا علم ہدایت کا ہے۔ وہ روحانی مسائل کے بارے میں ہے۔ مادی وسائل کا علم بھی الفاظ ہیں، معانی ہیں اور ہاتھ کی ہنرمندی اور skill کو استعمال کر کے آدمی مادی چیزوں کو سامنے لاتا ہے جو انسان کی ضرورتوں اور سہولتوں کو پورا کرتی ہیں۔ آج کی دنیا میں یہ مادی اشیاء ایک بہت بڑا آلہ ہیں۔ ساری جنگ ان مادی اشیاء کے ذریعے ہورہی ہے اس لئے **اعدو لکم مااستطعتم** میں

پہلے اگر گھوڑے، تلوار اور تیر تفنگ تھے تو آج کی دنیا میں ایٹمی توانائی ہے اور مختلف سائنسی علوم ہیں جن کے ذریعے ہم نے وہ قوت حاصل کرنی ہے کہ اقوامِ عالم کے سامنے کھڑا ہونا ہے اور ان کو جواب دینا ہے۔ تو وسائل کے اس علم کے بھی الفاظ ہیں، معانی ہیں اور پھر ہنرمندی ہے ہاتھ کی جس سے ان چیزوں کو وجود میں لایا جائے۔

جہاں تک روحانی مسائل ہیں وہ بھی الفاظ ہیں معانی ہیں لیکن یہ الفاظ و معانی صرف ہاتھ کی ہنرمندی تک نہیں ہیں۔ یہ الفاظ و معانی انسان کی روح، انسان کی عقل، انسان کے قلب اور انسان کے نفس، ان چاروں اداروں کو مخاطب کرتے ہیں۔ ان چاروں اداروں میں اس علم کی روشنی میں کچھ اثرات، کچھ کیفیات اور کچھ حقائق پیدا کرنا چاہتی ہے۔ اگر ان الفاظ و معانی کے بعد ان چار اداروں پر کچھ محنت کوشش ہوئی اور اندر وہ حقائق پیدا ہو گئے تو ان افراد کو کاملین کہتے ہیں۔ یہ افراد کاملین ہوتے ہیں۔ قوموں کو ایک تو ہنرمند افراد کی ضرورت ہوتی ہے اور ایک کاملین کی ضرورت ہوتی ہے۔ کاملین حضرات کے اندر وہ صفات ہوتی ہیں کہ جو ان اشیاء کو ٹھیک طریقے سے استعمال کر کے بہتر نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں مجھے جو موضوع دیا گیا تھا وہ ہے کلیۃ الشریعۃ۔ کلیۃ الشریعۃ کے ساتھ میرا پہلا تعارف اس طرح ہوا کہ خیبر میڈیکل کالج پشاور یونیورسٹی میں ہی واقع ہے، مجھ سے مختلف طلباء میڈیکل اور انجینئرنگ کے آکر پوچھتے کہ میرا دل چاہتا ہے میں کلیۃ الشریعۃ میں داخل ہو جاؤں۔ پوچھا کہاں پر ہے کہتے ہیں کراچی میں ہے۔ پوچھا اس میں تو بہت سے لوگ داخل ہو گئے ہوں گے۔ کہا نہیں جناب عالی! اس میں تو ٹیسٹ دینا پڑتا ہے، قابل لوگوں کو لیتے ہیں اور محدود نشستیں ہیں۔ سبحان اللہ۔ تو اس طرح تعارف ہوا۔ پھر ہم نے پوری معلومات کروائیں۔ اس نے کہا چار

سال کا کورس ہے۔ وہ آپ کے پورے وقت کو استعمال کرتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ پہلے سال میں ادارے کے اندر عربی کے علاوہ بات چیت کرنا بند ہے۔ اردو کی کچھ کتابیں تو پڑھاتے ہیں لیکن بات چیت اردو میں بند ہے۔ باقی تین سالہ تعلیم میں اگر کتاب سے کسی بات کی تشریح بھی کرتے ہیں تو عربی میں کرتے ہیں۔ اردو میں تشریح نہیں ہوتی۔ تین سال کے بعد ہمیں دورۂ حدیث میں باقی طلبہ کے ساتھ بٹھایا جاتا ہے جو کہ درسِ نظامی سے نکل کر آتے ہیں۔ کہا کہ آپکو حیرت ہوگی کہ اِن کی کارکردگی اُن سے زیادہ اچھی سامنے آ رہی ہے۔ پوچھا اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ انھوں نے کہا کہ پھر ہماری رہنمائی کی جاتی ہے کہ مستقبل میں کیا کریں گے۔

عرض یہ ہے کہ کلیۃ الشریعۃ جو کام کر رہا ہے، کالجوں، یونیورسٹیوں کے گریجویٹ یہاں پر آتے ہیں اوران کو دینی تعلیم دی جاتی ہے۔ان کی استعداد بہت اچھی ہوتی ہے کیونکہ آپ کا ذہین ترین طبقہ میڈیکل میں جا رہا ہے، دوسرے نمبر پر انجنیئرنگ میں جا رہا ہے۔ان کو اگر آپ درسِ نظامی کی تربیت سے گزاریں تو آپ کو اس دور میں بھی امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی یادگاریں دیکھنا نصیب ہو جائیں۔ مولانا یوسف بنوری صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ہمارے پاس مدرسوں میں ایسے آتے ہیں کہ کوشش کرتے کرتے، دینی علم کی برکت ہوتی ہے کہ، استعداد والے آدمی پیدا ہو جاتے ہیں، ورنہ ہمیں تم لوگ اچھی استعداد والے نہیں دیتے ہو۔ کلیۃ الشریعۃ سے جو پڑھ کے نکل رہے ہیں یہ ایک ایک آدمی نہیں ہے بلکہ اگر پشاور کی انجنیئرنگ یونیورسٹی سے آیا ہے تو ان سب کا نمائندہ ہے، اگر ڈاکٹر ہے تو سب ڈاکٹروں کا نمائندہ ہے۔ یہاں کے ڈاکٹر، انجنیئر ساری دنیا میں جہاں کہیں جائیں گے ساری عُمر ان سے رابطہ رکھیں گے اور ان سے رہنمائی لے گے۔ آپ حیران رہیں گے کہ میں

دینی لحاظ سے زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں لیکن یہ میرے شیخ حضرت مولانا اشرف صاحبؒ کی برکت ہے کہ دنیا بھر میں، امریکہ، برطانیہ، جہاں کہیں بھی ڈاکٹر گئے ہوئے ہیں انھیں ضرورت پڑتی ہے مسئلے مسائل کی یا رہنمائی کی تو مجھ سے ٹیلیفون کر کے پوچھتے ہیں۔ کئی موقعوں پر میں ان کی رہنمائی کے قابل نہیں ہوتا تو میں جا کر مفتی حضرات سے پوچھتا ہوں، اہلِ علم سے پوچھتا ہوں، سب سے پوچھ کر جلد از جلد ان کا مسئلہ حل کر کے ان کو بتاتا ہوں۔ مجھے اس بات کا احساس ہوتا رہتا ہے کہ ان ڈاکٹر صاحبان نے مجھے اپنا نمائندہ بنایا ہوا ہے اور اتنا شعور ان کو نہیں ہے کہ ہمارے پاس بھی مفتی ہیں، علماء ہیں، مدارس ہیں، ان سے پوچھیں۔ مجھ پر ان کا اعتبار ہے کیونکہ اس طبقے سے لے کر پھر اس طبقے کی طرف مجھے واپس کیا گیا۔ لہٰذا کلیۃ الشریعۃ پورے طبقات کی رہنمائی کر رہا ہے۔ ایک ایک آدمی جو یہاں سے بن کر جا رہا ہے وہ بہت زیادہ اثرات اپنے پورے طبقے پر ڈال رہا ہے جہاں سے وہ آیا ہے۔

اگلی بات یہ ہے کہ ان چار اداروں پر کام کر کے ان میں وہ صفات پیدا کرنی ہیں۔ جب تک اہلِ تصوف کے بیعت کے سلاسل سے پوری رگڑا رگڑی کے ساتھ نہ گزرا جائے تو آدمی کے اندر وہ بات پیدا نہیں ہوتی۔ یہ محض الفاظ و معانی نہیں ہیں، یہ قلب و نفس کے حقائق ہیں۔ England میں ہمارا ایک سفر تھا۔ وہاں ایک جگہ پر ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس ادارے میں سارے ڈاکٹر مسلمان ہیں، صرف دو انگریز ہیں اور زیادہ آپ کے پشاور کے ہیں اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ وہ غیر مقلد بھی ہو گئے ہیں۔ ان کے سامنے تصوف پر بیان کرنا ہے۔ میں نے کہا فکر نہ کریں اور ان کے غیر مقلد ہونے سے ڈریں نہیں، میں ان سے بات کروں گا۔ خیر جب ہم گئے تو وہ میرے شاگرد تھے، نماز پڑھانے کے لئے انھوں نے مجھے ہی آگے کیا۔ میں نے کہا

میرے پیچھے تم جتنی زور سے آمین کرو مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ جب بیان شروع ہوا تو ان سے میں نے کہا: ''تصوف کیا ہے؟ تیرا نفس جب گناہ کے جذبات سے بھڑک اٹھے تو اسے کیسے control (قابو) کرتے ہیں، کیسے جگہ پر لاتے ہیں''۔ بیان ختم ہوا تو ان کی تنظیم کے نائب صدر نے مجھے علیحدہ کر کے کہا کہ تو جو کہہ رہا ہے کہ نفس گناہ کے لئے بھڑکے تو قابو ہوتا ہے تو یہ کیسے ہوتا ہے؟ میں نے کہا یہ ایک تقریر سے تو نہیں ہوتا، اس کے لئے تو ادارے میں داخل ہونا ہوتا ہے، تربیت سے گزرنا ہوتا ہے، پھر یہ بات ہوتی ہے۔ روحانی خصائل کی تو دنیاوی علوم والے کو بھی ضرورت ہے۔ اس کے اندر اگر یہ صفات اور خصائل ہوں گے تو وہ کام کا ہے۔ اگر نہیں ہوں گے تو وہ ان چیزوں کو اتنا خراب استعمال کرے گا اور آپ کے لئے اتنی مصیبتیں کھڑی کر دے گا کہ اس کا کوئی حل نہیں ہوگا کیونکہ روحانی تربیت نہیں ہے۔

جس وقت افغانستان کا جہاد شروع ہوا تو اس میں ان کے دانشور، لیڈر، علماء ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ یہاں سے سارے روس کے خلاف جہاد کر رہے تھے۔ اس زمانے میں ضیاء الحق کا یہ جذبہ تھا کہ ان لیڈروں کو ہم اپنے اداروں میں بلائیں، اپنی جگہوں پر بلائیں، ان کی دعوتیں کریں تاکہ ان کا جذبہ ہمیں منتقل ہو اور ہمارے تصوف کے سلاسل، ہمارے علماء کی فراست اور دینی سیاسی زعماء کی ترتیب اُن کے سامنے آئے۔ ہمارے بڑے حضرت صاحب حضرت مولانا فقیر محمد صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے جو حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے افغان دانشوروں اور لیڈروں کی ایک دعوت کی۔ اس میں ان کے صاحبزادے عبدالرحمان صاحب نے مجھ سے کہا کہ پروفیسر برہان الدین ربانی کے ساتھ آپ بیٹھیں۔ یہ ربانی صاحب بعد میں ان کے صدر بھی بنے۔ میں ان کے ساتھ بیٹھا، تعارف کروایا، بات چیت شروع ہوئی۔ میں

نے کہا پروفیسر صاحب آپ کے ملک کو روس نے اسلحے سے فتح نہیں کیا بلکہ نظریے سے فتح کیا۔ آپ کے طالبِ علم روس جاتے رہے، میڈیکل، انجینئرنگ، مختلف ہنر اور فن سیکھنے کے لئے، روس نے ان کو صرف ڈاکٹر، انجینئر، فزکس کا ماہر، کیمسٹری کا ماہر ہی نہیں بنایا۔ اس نے اپنی دہریت کا نظریہ بھی سکھایا۔ جب اس نے دیکھا کہ اتنے افراد اس کے افغانستان میں ہو گئے ہیں کہ اب اگر میں فوج اتاروں تو تائید حاصل ہو گی تو اس کے بعد اس نے فوج اتاری ہے۔ چونکہ آدمی سمجھدار تھا اس نے بات کو مانا۔ میں نے کہا کہ پروفیسر صاحب آپ کے مسئلے کا ایک عارضی حل ہے اور ایک دائمی حل ہے۔ عارضی حل آپ کے مسئلے کا تو وہ جہاد ہے جو آپ کر رہے ہیں، ہمیں بھی آپ کے ساتھ مل کر روس کے خلاف لڑنا چاہیئے، ہمیں بھی اللہ توفیق دے لیکن یہ عارضی حل ہے، دائمی حل یہ ہے کہ آپ کا نوجوان عقیدہ اور یقین کے لحاظ سے مضبوط ہو، اس کا باطنی تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ مضبوط ہو تو پھر آپ دائمی طور سے اس کے چنگل سے نکلیں گے۔ ساری باتوں کی انھوں نے تائید کی۔ ہمارے حضرت صاحب کی برکت تھی کہ ان کے آگے کوئی بول نہیں سکتا تھا اس لئے انھوں نے سب باتوں کو سنا۔

عرض یہ ہے کہ تعلیم کے الفاظ اور معانی جب مجاہدے اور کوشش کے بعد باطن کے اندر کیفیات پیدا کرتے ہیں، باطن کے اندر حقائق پیدا کرتے ہیں تو تب آدمی بنتا ہے اور بنے ہوئے آدمیوں سے آگے پھر چیزیں بنا کرتی ہیں۔ میرا والد صاحب کی وجہ سے بچپن میں سکول کی زندگی میں حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی رحمتہ اللہ علیہ سے تعارف ہوا، ان کو میں نے دیکھا، ان کے بیانوں میں میں گیا، اس آدمی کے فقرِ ابوذری کو میں نے دیکھا، اس کی للکارِ حیدری کو میں نے سنا، اس کے وسائل دیکھے۔ ان کی سوانح 'مجاہدِ ملت' عبدالقیوم حقانی صاحب نے لکھی ہے۔ دو واقعات اس میں

لکھے ہیں۔ ایک یہ کہ دو آدمی آئے، بیٹھے رہے، ان کو کوئی کھانے پینے کا نہیں پوچھ رہے۔ حکمت ان کا پیشہ تھا۔ ایک آدمی آیا۔ اس نے دوا خریدی۔ انھوں نے کہا اب میرے پاس پیسے آئے ہیں کہ میں آپ کو چائے کھانے کا پوچھوں۔ جب اس کا جنازہ نکلا تو اس دو کچے کمروں والے گھر سے نکلا جو اس کو والد صاحب سے ملا تھا۔ اس پر وہ اینٹیں نہیں رکھ سکا۔ لیکن سارے پاکستان کے اخباروں پر اور اسمبلیوں پر، بڑے چھوٹے شہروں پر، سب جگہوں پر یہ آدمی پوری زندگی چھایا رہا۔ اس کے علاقے کے خوانین اس سے الیکشن نہیں جیت سکتے تھے۔ تو یہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنے عزم و یقین سے وسائل کو شکست دیتے ہیں۔

دوسرا جب صوابی میں خوانین قادیانی ہو گئے تو مرزا کا نام کوئی بے ادبی سے نہیں لے سکتا تھا۔ ہزاروی صاحب کہتے ہیں میں نے وہاں جلسہ کیا تو پہلے تو کوئی جلسے کی جگہ نہیں دے رہا تھا۔ خوانین آکر مسلح کھڑے ہو گئے۔ مولانا لطف اللہ صاحب نے جب کہا کہ غلام احمد قادیانی کافر تھا تو آدمی اٹھا، پستول تان کر آگے آیا تو ہزاروی صاحب کھڑے ہوئے اور کہا کہ تو نے کہاں سے غیرت سیکھی ہے، تیرے تو مذہب میں غیرت نہیں ہے، آ! فائر کر میں دیکھتا ہوں تیرے اندر کتنی غیرت ہے۔ ایک نعرۂ تکبیر بلند ہوا اور خوانین جو چارپائیوں پر بیٹھے تھے ان کی چارپائیاں لوگوں نے الٹا کر گرائیں اور پولیس کو مجبوراً ان سے اسلحہ لینا پڑا۔ جب آدمی بنا ہوا ہو، اس میں عزم و ہمت ہو تو یہ وسائل کا محتاج نہیں رہتا، یہ چھا جاتا ہے۔

۱۹۸۰ء کے ہندوستان کے سفر میں سہارن پور حاضری ہوئی۔ شام کا کھانا سب کا اکٹھا دیا گیا۔ صبح کے وقت مولانا طلحہ صاحب نے کہا کہ مشائخ، علماء، شیخ الحدیث اور مفتی حضرات کا ناشتہ حضرت مولانا زکریا صاحب (رحمتہ اللہ علیہ) کے گھر

پر ہوگا۔ گھر پر اشراق تک جہری ذکر ہوا۔ گھر کیا تھا، تین دیواریں پاس والے مکانوں کی تھیں، ایک دیوار آگے بنا کر اس میں کھڑکی دروازہ کر کے ایک کمرہ بنایا ہوا تھا۔ ایک برآمدے میں ان کی کتابیں تھیں اور ایک برآمدے میں ہمیں ناشتے کے لئے بٹھایا گیا۔ یہ کل اساس تھی۔ وہ اس خاندان کا آدمی تھا جن کی آبائی زمینوں کو آباد کرنے والے مزارعین کے دوسو کوٹھے تھے۔ اس آدمی کو دیکھا۔ لوگ کہتے ہیں سعودیہ والے تصوف کے مخالف ہوتے ہیں۔ ہم نے سعودیہ میں دیکھا کہ پہیّے والی کرسی پر ایک افغانی جُبّہ پہنے بیٹھے ہیں کہ جس پر پیوند بھی لگے ہوئے تھے اور شیخ عبدالعزیز بن باز تعارف کروا رہا ہے **ھذا شیخ زکریا. حنف موئطا امام مالک.** یہ وہ شیخ زکریا ہیں جنھوں نے موئطا امام مالک کی ایسی شرح لکھی ہے کہ اسے حنفی بنا کر چھوڑا۔ اور وہ ایسا ٹھیٹھ تصوف والا آدمی، اس کو کوئی چھیڑ نہ سکا کیونکہ اس کا اللہ کا تعلق تھا۔

آخری بات جو میں آپ سے عرض کروں گا وہ یہی ہے کہ الفاظ و معانی پر جب محنت و مجاہدہ ہوتا ہے اس سے انسان کی عقل، قلب، روح اور نفس پر اثرات آتے ہیں اور اس سے شخصیت بنا کرتی ہے۔ ہمارے حضرت صاحبؒ فارسی کے بھی ماہر تھے اور اردو کے بھی۔ اشعار بڑے چنے ہوئے پڑھتے تھے۔ انھوں نے ایک شعر سنایا کہ

؎ کاشتی تخمِ محبت در دلِ من کاشتی
آخرش دادی مُرا چیزے کہ تو خود داشتی

کاشت کرلیا، کاشت کرلیا محبت کا بیج میرے دل میں کاشت کرلیا۔ آخر مجھے وہ چیز دے دی جو خود تیرے پاس تھی۔

تو چیز اس سے ملا کرتی ہے جس کے پاس ہوتی ہے۔ سارے علم کے بعد میرے بھائی تمہیں ڈھونڈنا پڑے گا، رگڑا لینا پڑے گا اور اس نظام سے گزرنا پڑے گا جس سے ہمارے اکابر گزرے اور گزرنے کے بعد اس راز کو پایا جو کہ دیوبند کا اصلی راز ہے اور وہ راز تصوف ہے جو کہ روحانی چیز ہے اور ایک جوہر ہے جس کے لئے ہمارے بزرگوں نے بہت کوشش کی۔ و آخر دعوٰنا عن الحمدللّٰہ ربِ العالمین.

☆☆☆☆☆☆☆

جھوٹی چیونٹی

انسان اور چیونٹی میں ایک چیز قدرے مشترک ہے، وہ ہے ذخیرہ اندوزی۔ حافظ امام ابن قیمؒ نے واقعہ لکھا ہے کہ امام احمدؒ کے سلسلہ مشائخ میں سے ایک شخص کا بیان ہے کہ ایک چیونٹی اپنے بل سے نکلی اور اُسے مری ہوئی ٹڈی کا ایک ٹکڑا ملا۔ اس نے اُٹھانا چاہا مگر نہ اُٹھا سکی۔ اس کو چھوڑ کر گئی اور اُٹھانے کے لئے کئی چیونٹیوں کو بلا لائی۔ میں نے اُس ٹکڑے کو زمین سے اُٹھا لیا۔ وہ سب اس جگہ گھوم کر تلاش کرنے لگیں جب نہ ملا تو باقی واپس چلی گئیں اور وہ اکیلی رہ گئی۔ میں نے وہ ٹکڑا اُس کے آگے رکھ دیا۔ اُس نے پھر اُٹھانا چاہا لیکن نہ اُٹھا سکی، پھر چلی گئی پھر اُن کو ساتھ لے آئی۔ میں نے پھر وہ ٹکڑا اُٹھا لیا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر چلی گئیں۔ میں نے کئی بار ایسا کیا۔ آخر یہ ہوا کہ اُن چیونٹیوں نے اسی چیونٹی کو گھیرے میں لے کر اُس کا ایک ایک عضو الگ کر دیا۔ میں نے یہ حکایت اپنے اُستاذ سے ذکر کی تو انہوں نے فرمایا، ’’دوسری چیونٹیوں نے اس چیونٹی کو اس لئے مارا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی فطرت میں یہ بات ڈال دی ہے کہ جھوٹ برا ہے اور جھوٹے کو سزا دینی چاہئے اور وہ چیونٹی اُن کے نزدیک جھوٹی ثابت ہوئی تھی۔

(آئی ایم ایس پبلیکیشنز کی کتاب ’مختصر پر اثر‘ سے ڈاکٹر محمد طارق صاحب کا انتخاب)

تیرے جانے کے بعد تیری یاد آئی

(حضرت ڈاکٹر فدا محمد صاحب دامت برکاتہٗ)

ڈاکٹر حفظ الرحمٰن صاحب ایم بی بی ایس اور چیسٹ اسپیشلسٹ جب فوت ہوئے تو بندہ کو مشکلات کی وجہ سے جنازہ کی حاضری نصیب نہ ہوئی۔ بندہ کے بھتیجے اور بہنوئی بطور نمائندہ شریکِ جنازہ تھے۔ڈاکٹر صاحب کی یاد دل میں تھی اور بندہ اپنے ذمے فرض سمجھتا تھا کہ ضرور اُن کو رسالے میں یاد کریں گے۔آج تو ایسی یاد آئی کہ رُلا ہی دیا جب اُن کی اہلیہ کی طرف سے ٹیلیفون آیا کہ پیسے بھیجنے کے باوجود اُن کا رسالہ نہیں پہنچا اور رسالے کے ساتھ اُن کی روحانی وابستگی بھی ہوئی ہے۔فوراً دل میں خیال آیا کہ ان کا رسالہ اعزازی ہونا چاہئے۔

ڈاکٹر صاحب ایک علمی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ بندہ کے پاس خیبر میڈیکل کالج میں داخل ہوئے۔شروع سے اُن کے والد صاحب نے بندہ کے حوالے کر دیا۔ بندہ تبلیغی جماعت کے کاموں میں بھی ساتھ پھراتا رہا اور اپنے شیخ و مربی حضرت مولانا محمد اشرف صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت بھی کرا دیا۔ دونوں چیزوں میں ڈاکٹر صاحب نے خوب محنت کی۔تھوڑے عرصے میں حضرت مولانا صاحبؒ کے پسندیدہ مریدوں میں ہو گئے۔ حضرت خاص توجہ سے نوازنے لگے۔ بندہ کے تو گویا چھوٹے بھائی تھے۔تعلیم کے بعد مانسہرہ میں ہی تقرری ہوئی۔خوب خدمتِ خلق میں لگے، بندہ کے خاندان پر تو احسانات کا خوب بوجھ ڈالا۔ حضرت مولانا صاحبؒ کی وفات کے بعد حضرتؒ کے خلیفہ جناب اختیار الملک صاحب کے ساتھ وابستہ ہوئے اور اُن کی مانسہرہ کی خانقاہ کے خوب حاضر باش رکن ہو گئے۔ اختیار الملک صاحب بھی اُن سے بہت خوش رہے۔اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر صاحب کو کئی حجوں کی سعادت نصیب فرمائی۔اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کے درجات بلند فرمائے، خاندان کو اپنی حفاظت میں رکھے اور اُن کی اولاد کو دنیا و آخرت کی سعادتیں نصیب فرمائے۔

ملفوظاتِ شیخ 〈ڈاکٹر فدا محمد دامت برکاتہٗ〉 (قسط۔۴۶)

(ظہور الٰہی فاروقی صاحب)

کسی کی عادات و اطوار، نفسیات و جذبات، جس کے ساتھ اس کی وابستگی ہے اس کو کبھی بھی نہ چھیڑیں اور خاص طور پر اسلام کی وابستگی کو:

فرمایا کہ کسی کی عادات و اطوار، نفسیات و جذبات، جس کے ساتھ اس کی وابستگی ہے اس کو کبھی بھی نہ چھیڑیں اور خاص طور پر اسلام کی وابستگی کو، اس کے اُصولوں کو، اس کی تہذیب کو، اس کی ثقافت کو، اس کے ماننے والوں کے جذبات کو، احساسات کو، جو کہ اُمتِ مسلمہ کے اندر ہیں۔ ان کا خاتمہ کرنے کے لیے کوئی بڑھ رہا ہو تو کیا یہ کوئی نعوذ باللہ مردہ دِین ہے کہ جس کے پاسبان نہیں؟ خدانخواستہ یہ کوئی مردہ دِین ہے کہ جس پر Stand لینے والے نہ ہوں، جس کا ساتھ دینے والے نہ ہوں۔ اِس وقت دُنیا کی تقریباً چھ ارب آبادی میں سے دو ارب مسلمان ہیں، کسی آدمی کو آپ دیکھ رہے ہوں گے کہ نہ نماز پڑھ رہا ہے، نہ روزے رکھ رہا ہے لیکن اس کی اتنی اسلام کے ساتھ وابستگی ہوگی کہ وہ جان دینے کو تیار ہو جائے گا۔ جس وقت کے بوسنیا کے مسلمانوں کا یہ حال کر دیا گیا کہ عورتیں سکرٹ پہن کر سڑکوں پر پھرنے لگیں اور ان کو کلمہ تک نہیں آتا تھا، لیکن اس وقت جب ان پر حملے ہوئے ہیں اور انہیں مجبور کیا گیا کہ عیسائی ہو جاؤ ورنہ تمہارا خاتمہ کرتے ہیں تو انھوں نے ایسے حالات میں بھی جانیں دی ہیں لیکن عیسائی نہیں ہوئیں۔ کلمہ نہیں آتا تھا، نماز روزہ نہیں تھا اور آدھی رانیں ننگی کی ہوئی سکرٹ پہنی ہوئی عورت نے عیسائیت قبول نہیں کی ہے اور اسلام پر جان دی ہے۔ صرف اتنی بات کا پتہ ہے کہ میں مسلمان ہوں۔ تو یہ وابستگی ہے بفضلہٖ

تعالیٰ اُمتِ مسلمہ کی اپنے ربِّ ذُوالجلال کے ساتھ اور حضور ﷺ کی ذاتِ باکمال کیساتھ۔ آج کل سیاسی لوگ مغرب کی خوشنودی کے لئے اور ان کے ذریعے اقتدار حاصل کرنے کے لئے اُمتِ مسلمہ کی تہذیب و ثقافت اور احساسات اور جذبات کے خلاف بیانات دے کر آگ کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ ان باتوں سے دشمن فائدہ اُٹھا کر جذباتی اور کم فہم لوگوں کے ذریعے قسما قسم فسادات ملک میں برپا کردے گا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اس بات کے سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

دُرست عقائد ذریعۂ برکت:

فرمایا کہ ہمارے ایک دوست رؤف حسن خان صاحب ہوتے تھے۔ لوکل گورنمنٹ میں چیف انجینئر تھے۔ ہندوستان سے ہجرت کئے ہوئے (Migrated) تھے۔ اُردو بولنے والے تھے۔ بنیادی طور پر سُوری پٹھان قبیلے سے تعلق تھا۔ اگر چہ پشتو نہیں بولتے تھے لیکن غیرت، حیا، مہمان نوازی اور جرأت پٹھانوں جیسی تھی۔ طبیعت میں عاجزی تھی، خیر و ہدایت کی طلب تھی اس لئے مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی تحریک میں شامل ہوئے، ہمارے شیخ و مربی حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانیؒ سے بیعت ہوئے۔ بہت انہماک سے ذِکر اذکار، جماعتوں کی خدمت، جماعت میں نکلنا، حضرت کی مجلس میں حاضری دینا شروع کیا۔ خود دیانت دار آدمی تھے لیکن زمینوں کے کاروبار کے سلسلے میں نوسربازوں کا شکار ہو کر بہت مشکلات میں تھے۔ ایک دن انہوں نے بطور گلہ کہا کہ ڈاکٹر صاحب! ہم سلسلہ میں بیعت ہوئے لیکن مسائل و مشکلات جُوں کے تُوں ہیں۔ ایک دوسرے سلسلے کا تذکرہ کیا جو قوالیوں میں مصروف، نماز روزے سے فارغ مست ملنگ بنے ہوئے تھے، کہ ان کے ہاں جو بیعت ہوئے ان کے مال بہت پھلے پھولے۔ خیر بندہ نے ان کی تسلی کے

لئے کہا کہ ان کے سلسلے میں واقعی حرام مال بہت پھلتا پھولتا ہے کیونکہ وہاں نہ تو خوفِ خدا ہے نہ شریعت کا لحاظ۔ ہمارے ہاں تو حلال کو ترقی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہوتی ہیں۔ کیا پتہ یہ حال ہمارے لئے زیادہ مفید اور موزوں ہو۔ اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا ہے:

عَسٰۤی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ ج وَعَسٰۤی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّھُوَ شَرٌّ لَّکُمْ ط وَاللّٰہُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ o

(بقرہ:۲۱۶)

ترجمہ: اور شاید کہ تم کو بُری لگے ایک چیز اور وہ بہتر ہو تمہارے حق میں اور شاید کہ تم کو بھلی لگے ایک چیز اور وہ بُری ہو تمہارے حق میں اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

(معارف القرآن)

یعنی بعض اوقات ہم ایک چیز کو پسند کرتے ہیں لیکن وہ ہمارے لئے شَر ہوتی ہے اور ایک چیز سے ہمیں ناگواری ہوتی ہے لیکن وہ ہمارے لئے بہتر ہوتی ہے۔ تو یہ اللہ تعالیٰ اپنے علم اَزل سے فیصلہ فرماتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں ہم نہیں جانتے۔ خیر اس کے بعد بندہ نے ان کے لئے بہت دُعائیں کروائیں لیکن قبول نہ ہوئیں۔ اچانک ایک دن باتوں باتوں میں انہوں نے کہا کہ سُود تو صرف اس کو کہتے ہیں کہ آپ کسی غریب کو اس کی ضرورت کے لئے پیسے دیں اور پھر اس پر اضافہ وصول کریں۔ لیکن جو پیسے آپ کسی کو کاروبار کے لئے دیتے ہیں اس پر جو اضافہ لیتے ہیں وہ سود نہیں۔ بندہ کو بڑا افسوس ہوا کہ ان کا تو عقیدہ ہی ٹھیک نہیں اور اگر عقیدہ ٹھیک نہ ہو تو اعمال کے پہاڑ بھی انسان کو فائدہ نہیں دیتے۔ اور عقیدہ کے سلسلے میں صرف چند الفاظ اور تصورات کے

بدل دینے سے کفر اسلام اور اسلام کفر سے مبدل ہو جاتا ہے۔ بندہ نے ان سے پوچھا کہ یہ بات آپ نے کہاں سے معلوم کی؟ کیونکہ بندہ کے سامنے دنیائے اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ اور مسائل کی بحث کے معرکۃ الآراء ادارے حنفی، شافعی، مالکی و حنبلی میں کہیں یہ مسئلہ ایسے نہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ ڈپٹی نذیر احمد کی تفسیر سے سیکھا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد ایک ریٹائرڈ جج تھے۔ کسی وقت دینی مدرسے میں پڑھتے تھے اور درمیانے درجے کا اُدھورا علم حاصل کئے ہوئے تھے۔ عربی اچھی تھی، دیوانِ خماسہ اور سبع معلقات پڑھے ہوئے تھے۔ جس مسجد میں پڑھتے تھے اس کے امام صاحب نے محلے کے چودھری کے ہاں مصالحہ پیسنے کی ڈیوٹی بھی ان کے ذمے لگائی ہوئی تھی۔ کیونکہ چودھری صاحب امام صاحب کا بھی خیال رکھتے تھے اور مسجد کی خدمت بھی کرتے تھے۔ مصالحہ پیسنے کے دوران چودھری کی بیٹی از راہِ مذاق ایک چھوٹی ڈنڈی سے ان کو ہاتھوں پر مارتی رہتی تھی۔ خدا کی شان جج بننے کے بعد یہی لڑکی عقدِ نکاح میں آ گئی۔ یہ طالب علم ہی تھے کہ ایک دفعہ ایک انگریز ماہرِ تعلیم مدارس کے قابل طلباء کو کالجوں کے لئے منتخب کرنے کے لئے انٹرویو لینے آئے۔ یہ تماشے کے لئے وہاں گئے۔ قد چھوٹا تھا کسی نے دھکا دیا اور یہ انگریز ماہرِ تعلیم کے آگے جا گرے۔ اس نے دیوانِ خماسہ اور سبع معلقات پوچھا۔ اس نے فرفر سنا دیا اور یوں کالج کے لئے منتخب ہو گئے۔ اُدھورا علم تو تھا ہی، جج بننے سے دانشور بھی بن گئے۔

؎ فکرِ فروزمندے کہ فرنگ داد مارا
ہمہ آفتاب لیکن اثرِ سحر ندارد (اقبال)

ترجمہ: وہ روشن خیالی جو انگریز نے مجھے دی وہ سورج ہی سورج ہے لیکن اس میں صبح کرنے کا اثر نہیں ہے۔

خلاف شرع قانون پر فیصلے دیتے دیتے دل بھی سخت ہو جاتا ہے۔ اس لئے ایسی تفسیر لکھ ماری جس میں اور غلطیوں کے علاوہ عقائد تک کی خطرناک چھیڑ چھاڑ کی گئی۔ رؤف حسن صاحب بندہ کی جمعہ کی تقریر سننے کے لئے آتے رہتے تھے۔ بندہ نے کئی جمعے اس موضوع پر تقریر کی۔ اللہ کے احسان سے ان کا یہ نظریہ ٹوٹا۔ بفضلہٖ تعالیٰ ہمارے شیخ و مربی حضرت مولانا محمد اشرف صاحبؒ تو مستجاب الدعوات تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے دُعائیں قبول فرمائیں کہ مسائل حل ہوئے اور ایسے عابد، ذاکر شاغل ہوئے کہ قابلِ رشک ہوئے۔ اتنی خدمتِ خلق کی کہ قابلِ رشک موت نصیب ہوئی۔ اللہ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

دُنیا میں آدمی سے نہیں لڑتا بلکہ دُنیا میں نظریہ نظریے سے لڑتا ہے:

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جس وقت کہ اکابر دیوبند لڑے اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے شاملی کے میدان میں انگریزوں کے ساتھ لڑے اور ان کے توپ خانہ پر قبضہ کیا اور حافظ ضامن صاحبؒ شہید ہو گئے تو انگریزوں کا فیصلہ ہوا کہ اس جنگ کی بنیاد مسلمان بنے ہیں کیونکہ قرآن پاک میں جہاد کا اور قیامِ حکومت کا حکم ہے۔ اسلامی حکومت کا قیام ہمارے فرائض میں سے اہم فریضہ ہے۔ اور اس کے لیے جدوجہد کرنا ہمارے ذمے ہے۔ یہ وہ دو باتیں ہیں جو انگریزوں کی حکومت کو یہاں پکا نہیں ہونے دیتیں۔ لہٰذا ان کا فیصلہ ہوا کہ مسلمانوں کا تھوک کے حساب سے قتل عام کیا جائے کہ ان کا نام و نشان باقی نہ رہے۔ یہ جرنیلی سڑک جو کہ طورخم سے لے کر کلکتہ تک جاتی ہے جس کو جی ٹی روڈ بھی کہتے ہیں، اس پر انگریزوں نے مسلح فوج چلائی۔ جن کو یہ حکم تھا کہ جو داڑھی والا سامنے آجائے اس کو Shoot کیا جائے۔ جان بچانے کے

لیے مسلمانوں نے پہلی بار یہ بے غیرتی اور(دیوثی) کی کہ داڑھی کے بال ہٹائے ورنہ مسلمان اس بے غیرتی کے لئے تیار نہیں ہوتا تھا۔ پھر انھوں نے یہ کیا کہ اگر یہ علامت ہٹا رہے ہیں تو جس کا گھٹنوں سے لمبا کرتہ ہو اس کو Shoot کرو کیونکہ یہ Fundamentalists (بنیاد پرست ، دہشت گرد) ہیں، اتنے سخت حالات ہوئے ہیں۔ ایک فوجی کا Reported خط ہے، اس نے لکھا ہوا ہے کہ ہم نے ایک باغی کو پھانسی پر لٹکایا ہوا ہے اور فارغ ہو کر کھانا کھا رہے ہیں اور اس کی جان نکل رہی ہے اتنے پیچ و تاب کھا رہا ہے کہ اُس کے بدن انگریزی کا آٹھ (8) کا ہندسہ بنا رہا ہے۔ اتنی سختی ہوئی لیکن تب بھی اللہ کے فضل و کرم سے آپ کا اور ہمارا خاتمہ نہیں کر سکے ہیں۔ آج کے دور میں دُنیائے اسلام میں عام طور پر اور پاکستان میں خاص طور پر دشمن یہاں سے دِین و مذہب ، یہاں کی ثقافت اور یہاں کا culture اور یہاں کی values، عادات و اطوار کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے۔ تجھے اس بات کا شعور نہیں ہے لیکن اُن کو اس بات کا اندازہ ہے کہ نظریہ عام چیز نہیں ہوا کرتی اس نے مستقبل میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر دوسرے نظریے کو توڑنا ہوتا ہے۔ یہاں کا گورنر گزرا ہے سر جارج روس کیپل ،جس کے نام پر اسلامیہ کالج کا روس کیپل ہال ہے۔ اس نے سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان (اسلامیہ کالج کا بانی) کو آدھی رات کو پیغام بھیجا کہ جلدی سے آ کر مجھ سے ملو۔ صاحبزادہ صاحب آدھی رات کو بے چارہ اُٹھا ، کپڑے بدلے، اس کے بعد بگھی (دو گھوڑوں والی گاڑی) باندھی پھر نکل کر آیا۔ ریلوے اسٹیشن کے سامنے جہاں سرکاری عمارتیں ہیں اس جگہ عبدالقیوم خان کا گھر تھا۔ روس کیپل کا گھر جہاں پی۔ اے خیبر ایجنسی کے دفتر ہیں وہاں تھا۔ ملنے کے لیے آیا اور پوچھا کہ کیا بات ہے؟ روس کیپل نے بتایا کہ خیبر ایجنسی میں ایک مولوی

اُٹھا ہے اور اس نے انگریزوں کے خلاف کام شروع کیا ہے۔ صاحبزادہ چونکہ اس کا بے تکلف دوست تھا اس نے کہا کہ آدھی رات کو مجھے اُٹھانے کی کیا ضرورت تھی، ایک مولوی ہی تو ہے صبح میں اس کو ٹھیک کر دوں گا۔ تو روس کیپل نے اس کے سامنے ایک تاریخی جملہ بولا۔ اس نے کہا تم مولوی کو معمولی سمجھتے ہو! Your Muhammad was not more than a mulla. تمہارا محمد ﷺ بھی تو ایک ملا ہی تھا۔ تو اہلِ کفر اس بات کو جانتے ہیں کہ نظریہ جب تک مٹ کر ختم نہیں ہو جاتا، اس نے انسانوں کو منظّم کر کے، ان کو اپنے پیروں پر کھڑا کر کے، دوسرے نظریے کو ضرور توڑنا ہوتا ہے۔ کیونکہ دُنیا میں آدمی آدمی سے نہیں لڑتا بلکہ دُنیا میں نظریہ نظریے سے لڑتا ہے۔ جو لوگ ان قدروں (Values)، ان عادات و اطوار کو، اس Culture, Cvilization، اس ثقافت و تہذیب کو، جو لوگوں کی نفسیات میں داخل ہوئی ہوتی ہیں، ان کا خاتمہ کرنے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو آگے سے شدید ردِعمل آتا ہے۔ اور ان دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا کر کسی ایک نے پاش پاش ہونا ہوتا ہے۔ میں آپ لوگوں کو ایک اہم پیغام دے رہا ہوں، وہ یہ کہ اس مملکت کے اسلامی نظریات، اس مملکت کا اسلامی Culture، اس مملکت کی اسلامی Civilization، اس مملکت کی اسلامی ثقافت، اس مملکت کی اسلامی تہذیب، اس مملکت کے آدمیوں کی اسلامی عادتیں، وہ ان کی نفسیات کا حصہ ہیں، ان کے جذبات کا حصہ ہیں، اگر ان کو ختم کرنے کی کوشش کرو گے تو آگے سے آپ کو سخت ردِعمل ملے گا۔ ردِعمل کے بارے میں حضرت سعدی شیرازیؒ نے زبردست دانشوری اور فلسفے کو ایک قصے میں بیان کیا ہوا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ایک آدمی کو ایک بلی نے بہت سخت نقصان

پہنچایا ہوا تھا۔ کبوتر، مرغیاں مختلف چیزیں اس کی کھائی ہوئی تھیں۔ تو اس نے سوچا کہ اس بلی کو میں ایسے آسانی سے نہیں ماروں گا۔ اس کو ایک کمرے میں بند کر کے پہلے میں دل کو ٹھنڈا کروں گا پھر ماروں گا۔ اس نے بلی کو کمرے میں بند کر کے لکڑی سے کچوکے دے کر اور لاتیں مار کر اس کو ٹارچر کرنا شروع کیا۔ بلی نے ایک دروازہ، دوسرا دروازہ، ایک کھڑکی دوسری کھڑکی، ایک روشندان دوسرا روشندان، ہر کہیں سے راستہ پانے کی کوشش کی۔ آخر اس نے جب دیکھا کہ ان کچوکوں سے اور اس ٹارچر سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے تو اس نے مارا جھپٹا اور آدمی کو گردن سے پکڑا اور اس کا خاتمہ کر کے چھوڑا۔ تو بھائی میرے اس کے لیے بڑی فوجیں، بڑے اسلحے کی ضرورت نہیں ہوا کرتی کیونکہ جس وقت انسان جذبات میں آ کر کام کرنا چاہتے ہیں تو پھر معمولی سے معمولی چیز بھی بہت بڑے بڑے خطرناک کام کر جاتی ہے۔ تو آگے پھر سعدی شیرازیؒ نے ایک عجیب دانشورانہ جملہ بولا ہے کہ 'کسی چیز کو اتنا زیادہ نہ ستاؤ، اتنا زیادہ ٹارچر نہ کرو، اتنا زیادہ کارنر نہ کرو کہ آخر وہ سب کچھ کرنے، مرنے مارنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ کبھی نہ کرنا، اس اُصول کو اپنی زندگی میں ہمیشہ کے لیے یاد رکھنا۔'

☆☆☆☆☆☆☆

اطلاع

آئندہ ماہانہ اجتماع انشاء اللہ بروز ہفتہ ۱۶ فروری ۲۰۱۳ء کو خانقاہ میں منعقد ہوگا۔ بیان عشاء کے بعد ہوگا۔

★★★★★★★

ملالے

(جناب خوشحال صاحب)

پورے ملک میں ملالہ کا ڈرامہ اسٹیج ہوا۔ سب نے سنا اور دیکھا۔ بندہ نے انٹرنیٹ پر اس کے خلافِ اسلام (Anti Islam) اور خلافِ پاکستان (Anti Pakistan) خیالات لے کر اس سے پہلے بھی ایک مضمون ماہنامہ غزالی میں لکھا۔

بندہ کی بڑی خواہش تھی کہ وہ عظیم افغانی لڑکی جو ۱۸۸۰ء کی قندھار کی جنگ میں میوند کے صحرا میں انگریزوں کے خلاف معرکے میں شہید ہوئی ہے۔ اس کے حالات کہیں سے ملیں تو غزالی کے صفحوں کی زینت بنیں۔ اللہ کے فضل سے برخوردار خوشحال قندوسی افغانی نے حوالہ نکال کر پورا واقعہ دے دیا جو درج ذیل ہے۔ (ڈاکٹر فدا محمد دامت برکاتہٗ)

۲۷ جولائی ۱۸۸۰ء کا ایک گرم دن تھا کہ قندھار پر انگریزوں کی بارہ ہزار فوج نے حملہ کر دیا۔ اس میں ہندوستان کے غیر مسلم گورکھا فوجی تھے جو اپنی جنگجوئی میں پورے ہندوستان میں شہرت رکھتے ہیں۔ اُس وقت دنیا میں برطانیہ کا طوطی بول رہا تھا اور برطانیہ دنیا کی سپر پاور تھا۔ جدید ہتھیاروں سے لیس فرعونی اور طاغوتی لشکر قندھار کی طرف بڑھا۔ میوند کے مقام پر مجاہدین نے اس لشکر کا سامنا کیا۔ مجاہدین کی تعداد بھی کم تھی اور اسلحہ بھی معمولی اور روایتی تھا۔ جب میدانِ جنگ گرم ہوا اور دونوں اطراف سے حملے ہوئے تو برطانیہ کا پلہ بھاری ہو گیا۔ گرمی، پیاس اور تھکاوٹ نے مجاہدین کو نڈھال اور بے حال کر دیا۔ دوران جنگ جھنڈا اٹھانے والا علمبردار سخت زخمی ہو کر گرا اور ساتھ مجاہدین کا جھنڈا بھی گر گیا۔ یہ حال دیکھ کر ایک ۱۹ سالہ

لڑکی نے میدان میں کود کر جھنڈا اٹھا کر دوبارہ بلند کر دیا۔ اُس جوش کے عالم میں پشتو کے یہ اشعار اُس کی زبان سے نکلے۔

خال به دَ یار دَ وینو کیگدمه
چه شنکی باغ کی سور گلاب و شرموینه
که په میوند کے شهید نه شوے
خدائے گو! لالیه بے ننگیے ته دی ساتینه

دوست کے خونِ شہادت سے داغ رکھوں گی
جو سبز باغ کے پھولوں کو مات دے دے گا
ہوا شہید نہ میوند میں، تو پھر سن اے دوست
خدا گواہ ہے ذلت کی زندگی ہوگی

ان اشعار کا سننا تھا کہ لشکر میں گویا آگ لگ گئی۔ اس زور کا افغانی مسلمانوں کا حملہ ہوا کہ بارہ ہزار انگریزی فوج تتر بتر ہو کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ لیکن تھوڑے لوگ بھاگنے میں کامیاب ہوئے اور اکثر کی لاشیں میدانِ جنگ کی زینت بنیں۔ جنگ کے خاتمے پر جب لاشیں اٹھائی جانے لگیں تو ان میں ملالے کی لاش بھی خون میں لت پت اٹھائی گئی اور میوند کے میدان ہی میں دفن کر دی گئی۔

بنا کردن خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

بنائی ہے یہ اچھی رسم تڑپنا خاک اور خون میں
خدا کی رحمتیں ان پاک طینت عاشقوں پر ہیں

☆☆☆☆☆☆☆

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ

(جناب عبداللہ صاحب)

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا خاندان شمالی عراق کے تاریخی شہر حران کا مشہور علمی اور ادبی خاندان تھا۔ شیخ الاسلام کے دادا ابوالبرکات مجدالدین ابن تیمیہؒ کا شمار مذہب حنبلی کے ائمہ و اکابر میں ہے۔ شیخ الاسلام کے والد شہاب الدین عبدالحلیم ابن تیمیہؒ عالم ومحدث وفقیہ اور صاحب درس و افتاء تھے۔ اس نامور اور مخلص علمی و دینی خاندان میں دوشنبہ دس ربیع الاول ۶۶۱ھ (۱۲۶۳ء) کو تقی الدین ابن تیمیہؒ کی ولادت ہوئی۔ باپ نے احمد تقی الدین نام رکھا۔ بڑے ہوکر انہوں نے ابو العباس کنیت اختیار کی، لیکن خاندانی لقب ابن تیمیہؒ سب پر غالب آیا اور اسی نام سے مشہور ہیں۔ خاندان ابن تیمیہؒ کی وجہ تسمیہ مؤرخین نے یہ بیان کیا ہے کہ امام صاحب کے جد امجد محمد بن خضر ایک مرتبہ حج کرنے گئے۔ یمن کی بستی تیما میں سے گزرے تو وہاں ایک نہایت خوبصورت اور پاکیزہ اطوار کی لڑکی دیکھی۔ حج سے واپس آئے تو گھر میں بچی کی ولادت کا حال معلوم ہوا۔ چنانچہ محمد بن خضر اپنی اس بچی کو پیار سے تیمیہ کہہ کر پکارتے تھے پھر وہی اس کا نام ہوگیا۔ ابن تیمیہؒ سات برس کے تھے کہ ان کا وطن حران تاتاری حملے کے زد میں آگیا۔ مجبور ہوکر ان کا خاندان بھی شرفا وعلماء کے صدہا خاندانوں کی طرح کسی اسلامی ملک میں پناہ ڈھونڈنے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ اس وقت تاتاریوں کی غارت گری سے بچا ہوا سب سے قریب ملک شام تھا۔ اس خاندان نے دمشق ہی کا رخ کیا۔ اس پریشانی اور بے سروسامانی کی حالت میں اس علمی خاندان نے اپنے قیمتی کتب خانے کو جو کئی پشتوں کا اندوختہ اور ایک بڑا علمی سرمایہ تھا، جدا کرنا گوارا نہیں کیا۔ چنانچہ سب مال ومتاع چھوڑ کر کتابیں

ایک گاڑی پر بار کیں اور روانہ ہو گئے۔ تاتاریوں کا کھٹکا لگا ہوا تھا۔ ہر جگہ دہشت پھیلی ہوئی تھی، عورتوں اور بچوں کا ساتھ تھا، بڑی مشکل یہ تھی کہ جانوروں کے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے کتابوں کی گاڑی خود کھینچنا پڑتی تھی۔ دمشق پہنچتے ہی اس علمی گھرانے کی آمد کی خبر ہوگئی، چند دن کے اندر ہی جامع اموی اور دارالحدیث السکریہ میں عبدلحلیم ابن تیمیہؒ کا درس شروع ہو گیا۔ کمسن احمد ابن تیمیہؒ نے بہت جلد قرآن مجید کے حفظ سے فراغت کر لی اور حدیث و فقہ اور عربیت کی تحصیل میں مشغول ہو گئے۔ مؤرخین نے قبائلِ عرب میں کسی قبیلے کی طرف امام صاحب کو منسوب نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عربی نہیں تھے۔ غالب قیاس یہ ہے کہ وہ کردی تھے۔ کرد قوم بڑی بہادر، باحوصلہ اور عالی ہمت ہے۔ اس کی سیرت و کردار میں قوت کا رنگ جھلکتا ہے اور آتش خوئی کا بھی۔ یہ تمام صفات امام صاحب میں واضح اور نمایاں طور پر موجود تھیں۔ قرآن مجید بچپن ہی میں حفظ کرلیا اور زندگی بھر اس کا دور کرتے رہے۔ امام صاحب کے شوق تلاوت کا یہ عالم تھا کہ اپنی زندگی کے دور میں بھی تلاوت قرآن کا کبھی ناغہ نہ کیا اور یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے جیل میں ۸۰ سے زیادہ قرآن ختم کیے۔ حفظ قرآن کے بعد امام صاحب حفظ حدیث و لغت کی طرف متوجہ ہوئے۔ احکام فقہ کی معرفت حاصل کی اور ان کا بڑا حصہ ازبر کرلیا۔ حدیث کے ساتھ ساتھ امام صاحب نے دوسرے علوم و فنون کے حصول پر بھی پوری توجہ مبذول فرمائی۔ چنانچہ علوم ریاضی میں خاصی دسترس حاصل کی اور علوم عربیہ انتہائی ذوق و شوق سے پڑھے۔ وہ ہر مضمون کا اس محویت سے مطالعہ کرتے تھے گویا پوری زندگی اس کے لئے وقف کر چکے ہیں۔ عربی ادب کا بہت سا کلام نظم و نثر حفظ کیا۔ تاریخ جنگ و پیکار کا مطالعہ کرتے تھے۔ مسلمانوں کے عہد زریں اور ان کی مملکتوں کے حالات اور

عروج وزوال کے اسباب کو چھانا پھٹکا۔فن نحو سیکھا۔ایک طرف تو یہ کیفیت تھی کہ امام صاحب مذکورہ علوم وفنون میں غیر معمولی طور پر مصروف اور منہمک تھے۔ دوسری طرف یہ عالم کہ دل و جان سے تفسیر قرآن کے اسرار و رموز کی گرہ کشائی میں لگے ہوئے تھے۔تمام متعلقہ کتابیں اس مقصد کے لئے کھنگال ڈالیں۔ایک ایک لفظ کا پوری توجہ سے مطالعہ کیا جو کچھ ممکن تھا، اسے پڑھا، سوچا، سمجھا۔امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ ان سے ان کے علمی پائے تک پہنچنے کا ماجرا پوچھا گیا تو فرمایا 'میں نے علم وفقہ کے معدن میں زندگی کے دن بسر کیے، اہل علم کی خدمت میں حاضر رہا، جو بلند پایہ فقیہہ نظر آیا، اس کا دامن نہ چھوڑا' بالکل یہی کیفیت امام تقی الدین ابن تیمیہؒ کی بھی تھی۔انہوں نے اپنے صاحب علم وفضل والد کا دامن پکڑا اور ان سے وابستہ رہے۔جو بلند مرتبت عالم نظر آیا، حصول فیض کے لئے اس کے در پر تشنہ لب پہنچے اور سیراب ہو کر واپس آئے۔

ابن تیمیہؒ کا خاندان قوت حافظہ اور کثرت حفظ میں مشہور تھا۔ان کے دادا اور والد دونوں بڑے قوی الحفظ تھے، لیکن تقی الدین احمد ابن تیمیہؒ اس نعمت میں اپنے پورے خاندان سے سبقت لے گئے۔بچپن ہی میں ان کے عجیب وغریب حافظے اور سرعتِ حفظ نے علماء واساتذہ کو متحیر کر دیا اور دمشق میں اس کی شہرت پھیل گئی۔ایک مرتبہ حلب کے ایک بڑے عالم دمشق آئے۔انہوں نے سنا کہ ایک بچہ ہے جس کا نام احمد ابن تیمیہؒ ہے اور بہت جلد یاد کر لیتا ہے، ان کو اس کے دیکھنے اور امتحان لینے کا شوق پیدا ہوا۔جس راستے سے ابن تیمیہ گزرا کرتے تھے، وہاں ایک درزی کی دکان پر بیٹھ گئے۔تھوڑی دیر میں کچھ بچے مکتب جاتے ہوئے گزرے۔درزی نے کہا: دیکھیے، وہ بچہ جس کے پاس بڑی سی تختی ہے، وہی ابن تیمیہؒ ہے۔شیخ نے اس بچے کو

آواز دی، وہ آیا تو اس کی تختی لے لی اور کہا: بیٹا اس تختی پر جو کچھ لکھا ہوا ہے، اس کو پونچھ ڈالو۔ جب وہ صاف ہو گیا، تو انہوں نے اس پر کوئی گیارہ یا تیرہ حدیثیں لکھوادیں اور کہا ان کو پڑھ لو۔ بچے نے اس کو ایک مرتبہ غور سے پڑھا، شیخ نے اٹھالیا ور کہا سناؤ۔ بچے نے پوری حدیثیں سنادیں۔ شیخ نے کہا اچھا اب ان کو بھی پونچھ ڈالو، پھر چند سندیں لکھ دیں اور کہا پڑھو۔ بچے نے ایک بار غور سے دیکھا اور پھر سنا دیا۔ شیخ نے دیکھ کر فرمایا 'اگر یہ بچہ جیتا رہا تو کوئی چیز بنے گا' ابن تیمیہؒ کی بے نظیر قوت حافظہ کی ایک اور مثال دیکھیے۔ ایک دفعہ آپ کے والد اپنے سب بچوں کو تفریح کے لئے باغ میں لے جارہے تھے۔ انہوں نے ابن تیمیہؒ سے بھی کہا: احمد تم بھی بھائیوں کے ساتھ چلنے کے لئے تیار رہنا۔ تفریح ہو جائے گی۔ آپ نے معذرت کر دی اور والد کے اصرار کے باوجود باغ میں نہ گئے۔ شام کو ان کے بھائی واپس آئے تو والد نے ابن تیمیہؒ سے کہا! احمد تم بھی ساتھ چلے جاتے تو تمہارے بھائی بہت خوش ہوتے۔ وہ ہر لمحے تمہاری عدم موجودگی کو بری طرح محسوس کرتے رہے۔ آپ نے یہ سن کر نہایت ادب سے کہا! ابا جان میں نے آج یہ کتاب حفظ کر ڈالی ہے، ایک کتاب دکھائی۔ والد صاحب نے تعجب سے پوچھا ساری کتاب؟ اچھا سناؤ تو۔ ہونہار بیٹے نے ساری کتاب فرفر سنادی۔ والد نے انہیں گلے سے لگالیا، پیشانی پر بوسہ دیا اور فرمایا کسی سے کہنا مت مبادا نظر بد کا شکار ہو جاؤ۔ امام صاحب کے ایک معاصر ذہبیؒ نے ان کی صورت وسیرت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔ 'سفید رنگ، سیاہ بال، سیاہ ڈاڑھی جس کے بال کانوں کی لو تک پہنچے ہوئے، آنکھیں کیا تھیں، چشم گویا تھیں۔ چوڑا چکلا بدن، مونڈھے فراخ، آواز بلند اور شیریں، فصاحت و بلاغت کا جوہر نمایاں، کبھی غصہ بھی آجاتا لیکن اس کو اپنے حلم سے دبا لیتے۔ بارگاہ الٰہی میں عجز و نیاز،

آہ وزاری، اللہ کی طرف توجہ اور اس سے مدد طلبی میں آپ جیسا کوئی شخص دیکھنے میں نہیں آیا۔ان کی شخصیت میں خاص قسم کا دبدبہ تھا وزبان میں عجیب اثر اور حلاوت کہ جس سے بات کرتے، اس کے دل میں اترتے چلے جاتے۔ابن شاکر نے لکھا ہے کہ ابن تیمیہؒ نہایت متقی، پرہیزگار اور عابد تھے۔ان کی پوری زندگی اللہ کے مقرر کردہ حدود کی پابندی میں گزری۔ان کا لباس امیروں کی طرح شاندار اور بیش قیمت نہ ہوتا اور نہ وہ علماء کی طرح عمامے اور جبے کے قائل تھے۔جو مل جاتا پہن لیتے، جو مل جاتا کھا لیتے، آپ کے متعلق آپ کی زندگی میں اور وفات کے بعد بہت سے لوگوں نے بے شمار خواب دیکھے۔لوگ امام صاحب کی باتیں سننے کے لئے آتے اور مرید و معتقد اور ثناخواں بن کر واپس جاتے ۔ ان کے گرد مخلصوں اور فداکاروں کا ہجوم رہتا، ان کے درس میں ہر طبقے اور ہر خیال کے لوگ شریک ہوتے، موافق بھی اور نکتہ چیں بھی، اہل بدعت، اہل سنت اور مذاہب شیعہ کے پیروکار بھی۔امام صاحب کے شاگردوں کی تعداد کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔اس دور کے علماء جب امام صاحب کی یہ شان دیکھتے تو حیران و ششدر رہ جاتے۔ ابن دقیق جو اپنے زمانے میں فن حدیث اور دوسرے مروجہ علوم میں سند کی حیثیت رکھتے تھے، ابن تیمیہؒ کے بارے میں فرماتے ہیں' یہ ایسا شخص میری نظر سے گزرا ہے کہ سارے علوم اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔یہ شخص علوم کے عظیم خزانے میں جو چاہتا ہے، رد کر دیتا ہے۔ ایک اور موقع پر ابن دقیق نے امام صاحب سے ملنے اور ان کا کلام سننے کے بعد ارشاد فرمایا: میرا خیال تھا اب اللہ تعالیٰ آپ جیسا آدمی کہاں پیدا کرے گا'۔

تاتاریوں سے جہاد: ۶۹۹ھ میں تاتاریوں نے شام پر حملہ کیا۔۲۷ ربیع

الاول کو دمشق کے باہر قازان اور سلطان مصر و شام کے درمیان معرکہ پیش آیا۔ مسلمان جم کر لڑے اور بہادری سے مقابلہ کیا، لیکن مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ سلطانی افواج نے مصر کا رخ کیا اور اہل دمشق نے دمشق میں پناہ لی۔ اس شکست، مصری افواج کی واپسی اور تاتاریوں کی پیش قدمی کے خطرے سے شہر میں بدحواسی پھیلی ہوئی تھی۔ بڑے بڑے علماء اور سربرآوردہ اشخاص شہر چھوڑ چھوڑ کر مصر کا رخ کر رہے تھے۔ تاجر اور عوام شہر چھوڑ چکے تھے۔ حکومتی عملہ رخصت ہو چکا تھا۔ حکام میں سے صرف منتظم قلعہ ابھی مقیم تھا۔ طرفہ یہ ہوا کہ قیدی جیل خانہ توڑ کر نکل آئے۔ اوباشوں نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا۔ ادھر دمشق میں یہ طوفان بے تمیزی برپا تھا، ادھر قازان کی آمد کا غلغلہ تھا جس سے رہے سہے حواس اور پراگندہ تھے۔

قازان کے دربار میں: یہ حالات دیکھ کر اعیان شہر اور ابن تیمیہؒ نے مشورہ کیا اور یہ قرار پایا کہ ابن تیمیہؒ چند علماء اور رفقاء کی معیت میں قازان سے ملاقات کریں اور دمشق کے لئے پروانہ امن حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ دوشنبہ ۳ ربیع الاول ۶۹۹ھ کو دمشق کے نمایندہ اور اسلام کے سفیر ابن تیمیہؒ کی تاتاریوں کے جابر بادشاہ قازان سے ملاقات ہوئی۔ شیخ کمال الدین جو ابن تیمیہؒ کے ساتھ گئے تھے اور اس مجلس میں شریک تھے، اس ملاقات کا حال بیان کرتے ہیں' امام ابن تیمیہؒ تاتاریوں کے لشکر میں پہنچے۔ شاہ قازان اور دوسرے سرداروں سے ملاقات کی۔ قازان تاتاریوں کا چوتھا مسلمان سلطان تھا۔ امام صاحب کے پاس تلوار تھی نہ خنجر، لیکن ایمان اور تقویٰ کے اسلحہ سے مسلح تھے۔ ہیبت اور جلال کی خاص کیفیت ان پر طاری تھی۔ امام صاحب کے ساتھ وفد میں شریک ہو کر میں بھی گیا تھا۔ انہوں نے سلطان کے سامنے آیات قرآنی کی تلاوت اور احادیث رسول ﷺ کا بیان، عدل

وانصاف کے موضوع پر شروع کر دیا۔ ان کا لہجہ بلند ہوتا جا رہا تھا اور وہ جوش کے عالم میں سلطان کے قریب پہنچتے جا رہے تھے اور سلطان ہمہ تن گوش ان کی طرف متوجہ تھا۔تصویر حیرت بنا ان کی طرف دیکھ رہا تھا اور دم سادھے بیٹھا تھا۔ اس کے دل میں امام صاحب کی دہشت بیٹھ گئی تھی۔ اپنی بدنام تندخوئی اور درشت مزاجی کے باوجود سہما ہوا تھا۔ لیکن محبت بھری نظروں سے ٹکٹکی باندھے امام صاحب کی صورت دیکھ رہا تھا۔ آخر رہا نہ گیا بول اٹھا 'یہ کون بزرگ ہیں؟ میں نے آج تک اس جگرے (جرات) کا آدمی نہیں دیکھا، نہ کسی کی بات یوں تیر کی طرح میرے دل میں بیٹھی نہ کسی کے سامنے میں نے اپنے آپ کو ایسا بے بس پایا'۔ سلطان کو بتایا گیا کہ اس کا مخاطب علم و عمل کے اعتبار سے کیسا بلند مرتبت شخص ہے۔ ادھر امام صاحب کی تقریر گھن گرج اور جاہ و جلال کے ساتھ جاری تھی۔ اے قازان! تیرا دعویٰ ہے کہ تو مسلمان ہے تیرے ساتھ قاضی بھی ہیں، شیخ بھی اور اذان دینے والے مؤذن بھی جو خدائے واحد کے نام پر لوگوں کو بلاتے اور پکارتے ہیں۔ تیرے باپ دادا کافر تھے، لیکن وہ سیرت و کردار میں تجھ سے اونچے تھے۔ جو حرکتیں تو نے مسلمان ہو کر کی ہیں، وہ انہوں نے کافر ہو کر بھی نہ کی تھیں۔ وہ عہد کرتے اسے پورا کرتے تھے، مگر تو نے پیمان وفا باندھا اور توڑ دیا۔ جو بول تیرے منہ سے نکلے شرمندہ عمل نہ ہونے۔' امام صاحب نے تقریر ختم کی اور اٹھ کھڑے ہوئے لیکن قازان نے نہایت اصرار سے آپ کو روکا اور دسترخوان پر لے گیا۔ وفد کے دوسرے لوگوں نے کھانا کھایا لیکن امام صاحب نے ہاتھ روک دیا۔ قازان نے پوچھا! آپ کیوں نہیں تناول فرماتے؟ ارشاد فرمایا: 'اے سلطان! تیرا کھانا کس طرح کھا سکتا ہوں؟ یہ کھانا وہی تو ہے جو لوگوں کو لوٹ کر تیار کیا گیا ہے۔ یہ جو کچھ پکا ہوا سامنے موجود ہے، یہ انہی درختوں کی ٹہنیوں پر پکایا ہے جو ازراہِ ظلم

وجور کاٹے گئے ہیں۔' قازان نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ پھر امام صاحب سے دعا کی درخواست کی۔ امام صاحب نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور فرمایا: 'اے اللہ! اگر تیرے علم میں یہ ہے کہ قازان نے اس لئے تلوار میان سے نکالی ہے کہ تیرا کلمہ بلند ہو اور تیری راہ میں جہاد کرے، تو پھر اس کی مدد کی جیو، اسے اپنی نصرت سے نوازیو، لیکن اگر یہ جنگِ زرگری میں مبتلا ہے، دنیا اور بادشاہت اور توسیعِ مملکت کے لئے برسرِ پیکار ہے، تو پھر تو اس سے اچھی طرح سمجھ لی جیو۔' حالت یہ تھی کہ امام صاحب دعا کر رہے تھے اور قازان کے منہ سے بے ساختہ آمین کے الفاظ نکل رہے تھے اور ہم اس خوف سے اپنے دامن سمیٹے بیٹھے تھے کہ امام صاحب کی گردن ضرور اڑا دی جائے گی اور خون کے چھینٹے ہمارے لباس پر پڑیں گے۔ پھر جب ہم دربارِ سلطانی سے اٹھ کر باہر آئے تو ہم نے امام صاحب سے کہا: 'آپ نے تو آج ہم سب کی جان ہی لے لی تھی، بس سدھاریے، ہم آپ کے ساتھ نہیں جاتے۔' امام صاحب نے فرمایا: 'میں خود آپ حضرات کے ساتھ جانے کو تیار نہیں، جائیے تشریف لے جائیے۔' چنانچہ ہم لوگ چل کھڑے ہوئے اور امام صاحب پیچھے رہ گئے۔ ان کے اس کارنامے کا حال سن کر شہر کی عورتیں اور مرد، غریب اور امیر سب استقبال اور دیدار کے لئے آن موجود ہوئے۔ جب امام شہر میں داخل ہوئے، تو سینکڑوں عقیدت مندوں اور ثنا خوانوں کا ہجوم ہم رکاب تھا اور ہماری یہ گت بنی کہ ہم امام صاحب سے جدا ہوئے، آگے بڑھے تو غارت گروں (ڈاکوؤں) کی ایک جماعت نے ہم پر چھاپہ مارا اور کپڑے تک اتروا لیے۔'

تاتاریوں کی شکست:

۷۰۲ھ میں تاتاری پھر دمشق کی طرف بڑھے۔ ابن تیمیہؒ مصر گئے اور

سلطان کو جہاد پر آمادہ کیا۔ ۲ رمضان کو شقحب کے میدان میں ایک طرف شامی و مصری فوجیں اور دوسری طرف تاتاری لشکر صف آرا ہوا۔ سلطان بنفس نفیس لشکر میں موجود تھا، خلیفہ عباس ابوالربیع سلطان کے پہلو میں تھے۔ ابن تیمیہؒ کو فتح کا اس قدر یقین تھا کہ امراء و عوام سے قسم کھا کر کہتے تھے کہ تم اس مرتبہ ضرور فتح پاؤ گے۔ بالآخر دونوں لشکر آپس میں گتھ گئے اور جنگ کا بازار گرم ہوا۔ سلطان نے بڑی ثابت قدمی دکھائی۔ سخت معرکہ ہوا، بڑے بڑے ترکی امراء کام آئے۔ بالآخر مسلمانوں کو فتح ہوئی اور تاتاریوں کے قدم اکھڑ گئے۔ بھاگنے والوں کی ایک بڑی تعداد گھاٹیوں اور خطرناک جگہوں میں گر کر اور دریائے فرات میں ڈوب کر ہلاک ہوگئی۔

اصلاحِ عقائد اور ازالۂ منکرات:

تاتاریوں کے قصے سے فرصت پاکر ابن تیمیہؒ نے حسبِ معمول پوری سرگرمی کے ساتھ درس و تدریس، اشاعتِ سنت اور رد بدعات کا کام شروع کر دیا اور شرک و جاہلیت کے خلاف جہاد میں مشغول ہو گئے جو اُن کا محبوب مشغلہ اور زندگی کا ایک بڑا مقصد تھا۔ ایک زمانے میں عیسائیوں اور یہودیوں کے اختلاط اور فاسد العقیدہ اور جاہل مقتداؤں کی تعلیم سے مسلمانوں میں بہت سے ایسے اعمال آگئے تھے جو جاہلیت کی یادگار اور مشرک و بت پرست اقوام کا شعار تھے۔ دمشق کے نواح میں نہر قلوط کے کنارے ایک چٹان تھی جس کے متعلق مختلف قسم کی روایات مشہور تھیں۔ یہ جہلا اور توہم پرست مسلمانوں کے لئے ایک فتنہ بن گیا۔ مسلمان جاتے تھے اور وہاں منتیں مانتے تھے۔ ابن تیمیہؒ رجب ۷۰۴ھ میں مزدوروں اور سنگ تراشوں کو لے کر وہاں گئے اور اس چٹان کو کاٹ کر ایک بڑے فتنے کو ختم کر دیا۔ وہ شریعت اور سنت کے خلاف جو عمل دیکھتے، اس کو حتی الامکان اپنے ہاتھ سے بدل دینے اور روک دینے کی

کوشش کرتے، اس لئے کہ ایمان کا یہ اعلیٰ درجہ اور دینی حمیت کا اولین تقاضا ہے۔ حکام کو امورِ سلطنت سے فرصت نہ تھی۔ علماء بعض اوقات بہت سی چیزوں کو اہمیت نہیں دیتے تھے اور بعض اوقات انکار و مخالفت کرتے جھجکتے تھے، اس لئے ابن تیمیہؒ کو اکثر کام خود انجام دینا پڑتا تھا۔ رجب ۷۰۴ھ کا واقعہ ہے کہ ان کے پاس ایک پیر مرد، جو اپنے کو المجاہد ابراہیم بن القطان کہتا تھا، لایا گیا، اس نے بہت لمبی چوڑی گدڑی پہن رکھی تھی، بال اور ناخن بڑھے ہوئے تھے، لبیں منہ پر آرہی تھیں، گالیاں اور فحش کثرت سے بکتا تھا اور نشہ آور چیزوں کا استعمال بھی کرتا تھا۔ ابن تیمیہؒ نے اس کی گدڑی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کا حکم دیا۔ سب طرف سے لوگ ٹوٹ پڑے اور اس کا تار تار تبرک ہوگیا، سر کے بال اور لبیں ترشوائیں، ناخن کٹوائے، فحش گوئی اور نشے سے اس کی توبہ کرائی گئی۔

علماء و صوفیا کی مخالفت:

دمشق میں ابن تیمیہؒ کی ایک طرح کی دینی سیادت قائم ہوگئی تھی۔ وہ اگر دیکھتے کہ حکومت کسی بدعت یا فعلِ منکر کے روکنے میں تساہل سے کام لے رہی ہے اور علماء خاموش ہیں، تو وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لیتے اور خود شرعی احکام کا اجرا کرتے۔ ان کے ساتھ عقیدت مند تلامذہ اور دین دار اور صحیح العقیدہ عوام کی ایک بڑی جماعت تھی اور ان کا حلقۂ اثر بڑھتا جاتا تھا۔ ان کے علم و تقریر کے سامنے کسی کا چراغ نہ جلتا تھا، وہ جہاں رہتے، سب پر چھا جاتے تھے۔ درس دیتے تھے تو درس کی دوسری محفلیں بے رونق ہو جاتی تھیں۔ تقریر کرتے تھے تو علم کا دریا امڈتا نظر آتا تھا۔ ان کی شخصیت کی اس دلآویزی، بلندی اور عوام و خواص میں مقبولیت نے حاسدوں کا ایک طبقہ پیدا کر دیا جو ان کے زوال کا متمنی اور ان کی اہانت کے درپے

تھا۔ شیخ کی مخالفت کی ایک اور بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اس زمانے اور اس نسل کی عام ذہنی وعلمی سطح سے بلند تھے۔ اپنے زمانے کی سطح سے بلند ہونا ایک نعمتِ خداداد اور قابلِ رشک کمال ہے۔ مگر اس کمال کی صاحبِ کمال کو بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ وہ صاحبِ کمال اپنے معاصرین کی طرف سے ایک مسلسل ابتلا اور آزمائش میں رہتا ہے اور وہ معاصرین اس صاحبِ کمال کی طرف سے زندگی بھر ایک معصیت اور زحمت میں مبتلا رہتے ہیں۔ وہ اس کی تازگی فکر، بلندئ نظر، قوتِ اجتہاد کا ساتھ نہیں دے سکتے اور اس کے آفاقِ علم وفکر تک ان کی رسائی نہیں ہوتی اور وہ صاحبِ کمال ان کے معین ومحدود اصطلاحات اور مدرسی حدود میں مقید نہیں رہ سکتا۔ وہ علم ونظر کی آزاد فضاؤں اور قرآن وحدیث کے بلند اور وسیع آفاق میں آزادانہ پرواز کرتا ہے۔ ان سب اسباب نے مل کر شیخ الا اسلام کو عمر بھر ابتلا اور آزمائش میں رکھا۔ انہیں کئی بار قید وبند کے مراحل سے گزرنا پڑا، حتیٰ کہ قید ہی کی حالت میں انتقال ہوا۔ شیخ جہاں کہیں بھی رہے، انہوں نے اپنا کام جاری رکھا۔ جیل سے باہر ہوتے، تو عام درس و افادہ میں مشغول رہتے، ان کی ان مجالس میں لوگ دور دراز سے شرکت کے لئے آتے اور عوام وخواص سب دینی وعلمی فائدہ اٹھاتے، تطہیرِ افکار اور تزکیۂ نفوس کا کام جاری رہتا۔ ۷۰۵ھ میں انہیں پہلی مرتبہ مصر طلب کر کے مشہور قید خانے ''جُب'' (کنواں) میں قید کر دیا، جیل میں ان کے شب و روز کا ذکر کرتے ہوئے ''الکواکب الدریہ'' کے مصنف لکھتے ہیں۔ ''شیخ جب قید خانہ میں پہنچے تو دیکھا کہ قیدی لہولعب اور تفریحات میں مشغول ہیں اور اس طرح اپنا دل بہلاتے اور وقت کاٹتے ہیں شطرنج، چوسر وغیرہ کا زور ہے۔ نمازیں بے تکلف قضا ہوتی ہیں۔ شیخ نے اس پر اعتراض کیا اور قیدیوں کو نماز کی پابندی اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع، اعمالِ

صالحہ، تسبیح واستغفار اور دعا کی طرف متوجہ کیا اور سنت کی تعلیم اور اعمال خیر کی ترغیب شروع کر دی، یہاں تک کہ علم و دین کی ایسی مشغولیت شروع ہو گئی کہ یہ جیل خانہ بہت سی خانقاہوں اور مدارس سے زیادہ بارونق اور بابرکت نظر آنے لگا۔'

آخری اسیری:

۷ شعبان ۷۲۶ھ کو حکومت نے انہیں ایک بار پھر گرفتار کر کے قلعۂ دمشق میں قید کر دیا۔ قید و بند کے یہ لمحات شیخ کے لئے سکون اور یکسوئی کی دولت لے کر آئے۔ شیخ پورے انہماک اور ذوق وشوق کے ساتھ عبادت وتلاوت میں مشغول ہو گئے۔ اس سے جو وقت بچتا تھا، وہ مطالعہ وتصنیف اور اپنی کتابوں کی تنقیح وتصحیح میں صرف کرتے تھے جو خود ایک مستقل عبادت تھی۔ شیخ جیل جانے میں جو کچھ لکھتے، لوگ اس کو ہاتھوں ہاتھ لیتے اور وہ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ جاتا۔ آخر مصر کے قاضی عبداللہ بن الاخنائی کی شکایت پر سلطان نے فرمان جاری کیا کہ شیخ کے پاس جتنی کتابیں، کاغذ، قلم دوات ہیں، لے لئے جائیں اور ان کے پاس کوئی سامان نہ رہے جس کی مدد سے وہ تصنیف کر سکیں۔ ۹ جمادی الاخریٰ ۷۲۸ ہجری کو اس فرمان کی تعمیل ہوئی۔

انتقال:

اب زندگی کے دن پورے ہو چکے تھے۔ انتقال سے بیس روز پہلے طبیعت خراب ہوئی اور پھر درست نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ ۲۲ ذی القعدہ ۷۲۸ھ (۱۳۲۸ء) کی شب میں وقتِ موعود آ پہنچا اور اس مجمعِ کمالات ہستی نے سڑسٹھ (۶۷) برس کی عمر میں دنیا سے کوچ کیا۔ شہر میں بجلی کی طرح یہ خبر پھیل گئی۔ قلعے کا دروازہ کھول دیا گیا اور اذانِ عام دے دیا گیا۔ لوگ جوق در جوق آتے تھے اور

زیارت کر کے جاتے تھے۔ غسل کے بعد نمازِ جنازہ قلعے میں ہوئی۔ نماز کے بعد جنازہ باہر لایا گیا۔ چار گھڑی دن چڑھے جنازہ جامع اموی میں پہنچا۔ مجمع کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ ظہر کے بعد نمازِ جنازہ ہوئی۔ لحظ بلحظہ ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ میدان، گلیاں، بازار سب بھر گئے۔ ہر طرف مجمع ہی مجمع نظر آتا تھا۔ بازار بند تھا۔ نمازِ جنازہ کے بعد جنازہ اٹھا۔ کاندھا دینے کا موقع نہ تھا۔ جنازہ انگلیوں اور سروں پر جا رہا تھا۔ ہر طرف گریہ و بکا کی صدائیں بلند تھیں۔ جنازہ صبح کے وقت قلعے سے نکلا تھا، لیکن ہجوم کی کثرت کی وجہ سے کہیں عصر کی اذان کے وقت دفن کی نوبت آئی۔ بظاہر سارا شہر جنازہ کی مشایعت میں (ساتھ) تھا۔ ایسا ہجوم دمشق کی تاریخ میں دیکھا نہیں گیا۔

شخصیت و کردار:

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنے دور میں علوم اسلامیہ میں مجتہدانہ مقام حاصل کیا اور تفسیر و حدیث و فقہ میں بیک وقت اپنی امامت، تبحر اور غیر معمولی عبور کا جو نقش اپنے زمانے پر قائم کیا، اس میں بہت بڑا دخل ان کے غیر معمولی حافظے کو تھا۔ ان کے تبحرِ علمی اور ذہانت کا اندازہ اس واقعے سے ہوگا، جو ان کے ایک معاصر شیخ صالح تاج الدین بیان کرتے ہیں: ''میں ایک مرتبہ حاضر ہوا، ایک یہودی نے تقدیر کا ایک مسئلہ پوچھا تھا، اور اپنا سوال و اعتراض آٹھ شعروں میں لکھ کر بھیجا تھا۔ شیخ نے تھوڑی دیر تامل کیا، پھر جواب لکھنا شروع کیا۔ ہم حاضرین مجلس یہ سمجھتے رہے کہ وہ اس کا نثر میں جواب دے رہے ہیں، جب فارغ ہوئے، تو کسی نے کاغذ اٹھا کر دیکھا اور ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب ہم کو یہ معلوم ہوا کہ ٹھیک اسی قافیہ و ردیف میں شیخ نے ۱۸۴ اشعار میں برجستہ اس کا جواب دیا تھا۔ اس جواب میں

اتنے علوم آ گئے تھے کہ اگر ان کی شرح و تفصیل کی جائے تو ضخیم جلدیں تیار ہو جائیں۔''
ابن تیمیہؒ کی شجاعت و دلیری اور موت سے بے خوفی ان کے تمام معاصرین حتیٰ کہ ترک سرداروں اور فوجی افسروں کے لئے بھی حیرت انگیز تھی۔ جب وہ گھوڑے پر سوار ہوتے تھے تو دشمن کی صفوں میں اس طرح گھومتے تھے جیسے بڑے سے بڑا بہادر اور اس طرح کھڑے رہتے تھے جیسے بڑے سے بڑا ثابت قدم شہسوار۔ وہ دشمن کو اپنے حملوں سے چور کر دیتے تھے اور اس بے تکلفی سے فوج میں گھس جاتے تھے جیسے ان کو موت کا کوئی ڈر نہیں۔ ابن تیمیہؒ کی زندگی کا ایک نمایاں پہلو یہ تھا کہ وہ علمِ دین کی خدمت کے لئے ہمہ تن وقف تھے۔ انہوں نے زندگی بھر کسی چیز سے سروکار نہ رکھا۔ ان کے اکثر معاصرین، رفقاء اور ہم عمر، جن میں بڑے بڑے مخلص اور بڑے بڑے فاضل تھے، حکومت کے مختلف عہدوں پر فائز رہے یا عطیۂ سلطانی، خلعتِ شاہانی یا انعام و اکرام سے سرفراز ہوئے یا حکومت کے وظیفہ خوار رہے لیکن ابن تیمیہؒ کا دامن ساری عمر اِن آلائشوں سے پاک رہا۔ ان کے اخلاص و للّٰہیت کی ایک بڑی دلیل یہ تھی کہ انہوں نے اپنے حریفوں اور بدخواہوں کو ہر موقع پر معاف کیا اور صاف اعلان کر دیا کہ **حللت کل مسلم عن ایذئہ لی** (جس مسلمان نے بھی مجھے ایذا اور تکلیف دی ہے، میں اسے معاف کرتا ہوں) ابن انقلاسی کا بیان ہے کہا ابن تیمیہؒ

نے خود مجھ سے کہا کہ سلطان (ناصر بن قلاؤون دوبارہ برسرِ اقتدار آنے کے بعد) جب مجھے تنہائی میں لے گیا، تو اس نے مجھ سے ان قضاۃ کے قتل کے بارے میں فتویٰ لینا چاہا جنھوں نے (اس کے حریف) جاشنگیر کی حمایت کی تھی اور سلطان کی معزولی کا فتویٰ دیا تھا۔ اس نے وہ فتویٰ نکال کر دکھایا اور کہا کہ انہی لوگوں نے آپ کے خلاف شورش برپا کی اور آپ کو تکلیف پہنچائی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ میں اس سے

متاثر ہو کر ان کے قتل کا فتویٰ دے دوں۔ میں اس کا منشا سمجھ گیا اور میں نے ان قضاۃ و علماء کی مدح سرائی شروع کی اور اس کی شدت سے مخالفت کی کہ ان کو سلطان کے ہاتھ سے کوئی گزند پہنچے۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر آپ نے ان کو قتل کر دیا، تو آپ کو ان کا بدل نہیں ملے گا۔ اس نے پھر (مجھے مشتعل کرنے کے لئے) کہا کہ انہوں نے تم کو نقصان پہنچانے میں کمی نہیں کی اور بارہا تمہارے قتل کی سازشیں کیں، میں نے کہا جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، جس نے مجھے تکلیف پہنچائی، اس پر میری طرف سے کوئی مواخذہ نہیں، میں اسے بالکل معاف کرتا ہوں اور جس نے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا قصور کیا، تو اللہ تعالیٰ اس سے خود انتقام لے گا۔ میں اپنے نفس کا انتقام نہیں لیتا۔ میں برابر اس کو سمجھاتا رہا یہاں تک کہ سلطان نے ان کا قصور معاف کر دیا۔ امام ابن تیمیہؒ کی ذات خوش رنگ اور مشامِ جاں کو معطر کرنے والے پھولوں کا ایک دستہ تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ تاریخِ اسلام نے ان جیسے ہمہ صفت موصوف آدمی بہت کم پیدا کیے ہیں۔ عام طور پر لوگ یک فنی ہوتے ہیں یعنی جو شخص تفسیر میں یکتا ہے، وہ نقدِ حدیث کے فن سے ناواقف ہے۔ جسے حدیث پر عبور ہے وہ فقہ کے دشوار گزار مراحل طے نہیں کر پاتا۔ جو فقہ کا ماہر ہے، وہ منطق کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتا ہے۔ جو منطق سے آگاہ ہے، وہ فلسفے کا ذوق نہیں رکھتا۔ جو فلسفے سے آشنا ہے، وہ علمِ کلام کی ابجد بھی نہیں جانتا۔ جو علمِ کلام کے نقطۂ عروج کو پہنچ چکا ہے، وہ روحانیت سے یکسر غافل و بے پروا ہے، حتیٰ کہ ایسے افراد جو بے شمار علوم و فنون میں یکتا اور ادب و انشاء کی دنیا میں منفرد ہیں، وہ جنگ کے میدان میں قدم نہیں رکھ سکتے۔ مشہور ہے کہ جو ہاتھ قلم چلاتے ہیں، ان سے تلوار نہیں اٹھ سکتی، لیکن امام ابن تیمیہؒ کی ایک ذات میں یہ تمام کمالات جس حسن و خوبی سے قدرت نے جمع کر دیے تھے، انہیں دیکھ کر امام کے معاصرین عش عش

کرتے تھے اور آج بھی عالم یہ ہے کہ

ع عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تو مگر کہاں؟

ابن تیمیہؒ صرف صاحبِ قلم نہ تھے، صاحب سیف بھی تھے۔ ان کے قلم نے جو نقوش بنائے، وہ ایک ہزار کتابوں کے اوراق میں محفوظ ہیں، لیکن ان کی نوکِ شمشیر نے دشمنانِ اسلام کے سینے پر جو لکیریں کھینچیں، تاریخ نے انہیں بھی ناقابلِ فراموش بنادیا ہے۔ وہ بزم کے میرِ مجلس ہی نہ تھے، رزم کے امیرِ عساکر بھی تھے، وہ صرف جہاد کے مبلغ اور داعی نہ تھے، مجاہد صفِ شکن بھی تھے۔

؎ دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

؎ دورہا باید کہ تا یک مردِ حق پیدا شود
بایزیدؒ اندر خراساں یا اویسؒ اندر قرن

ترجمہ: اس بات کے لئے زمانے چاہئیں کہ ایک مردِ حق پیدا ہو۔ وہ خراسان کا بایزیدِ بسطامیؒ ہو یا قرن کا اویسِ قرنیؒ۔ (بشکریہ روزنامہ اسلام)

[امام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ بارہ واسطوں سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں۔] ادارہ

(صفحہ ۵۳ سے آگے) ڈاکوؤں کا سردار یہ سنتے ہی مولاناؒ کے قدموں میں گر گیا اور ڈاکوؤں کے پورے گروہ میں گریہ و بکا راہ وزاری شروع ہوگئی۔ اسی وقت سب ڈاکوؤں نے اپنے کام اور تمام گناہوں سے توبہ کی اور مولاناؒ کے قافلے سے لیا گیا سارا سامان واپس کر دیا۔ انہوں نے عہد بھی کیا کہ آج تک جن لوگوں کا سامان لوٹا یا کسی قسم کی تکلیف پہنچائی ہے، انہیں تلاش کر کے وہ ان کا سامان واپس کریں گے یا ان سے معافی مانگیں گے۔ (بشکریہ روزنامہ اسلام)

سفر نامہ ہندوستان (پہلی قسط)

(پروفیسر ڈاکٹر قیصر علی خان صاحب، شعبۂ سول انجینئرنگ، انجینئرنگ یونیورسٹی، پشاور)

سال ۲۰۱۰ء میں بیرون ملک کے دو سفر ہوئے۔ ۲۴ جولائی تا ۲۱ اگست تقریباً ایک مہینہ کینیڈا میں گزرا اور ۱۵ تا ۲۵ اکتوبر ۱۰ دن ہندوستان میں گزرے۔ ذیل میں ہندوستان کے سفر کی کچھ روداد پیشِ خدمت ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی کینیڈا کا سفر بھی قلم بند کرنے کا ارادہ ہے۔

ہندوستان کے سفر میں اللہ تعالیٰ نے دیوبند، سہارنپور، تھانہ بھون اور بستی نظام الدین وغیرہ میں کچھ لمحات گزارنے کا موقع دیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ موقع یوں عطا فرمایا کہ جنوبی ایشیا کے ممالک کی علاقائی تنظیم سارک نے زلزلوں سے ہونے والے نقصانات کے تدارک پر ہندوستان کے شہر روڑکی میں ایک تربیتی پروگرام منعقد کیا تھا۔ جس میں تقریباً سارے سارک ممالک کے نمائندوں نے شرکت کی۔ پاکستان سے ہم تین لوگوں نے شرکت کی۔ سارک تنظیم کے تحت منعقد ہونے والے پروگراموں کے لیے ہندوستان کے ویزے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے سارک کے دہلی ہیڈ آفیس سے ایک خط سارک کے سیکرٹری کے دستخط سے جاری ہوتا ہے۔ اس خط پر متعلقہ ملک کے وزارتِ خارجہ کا دفتر پاسپورٹ کے اندر ایک چھوٹا سا کاغذ (سارک اسٹیکر) لگاتا ہے۔ جس کے بعد سارک ممالک جانے کے لیے ویزے کی ضرورت نہیں پڑتی اور یوں ویزے کا یہ بظاہر مشکل مرحلہ بخیر و خوبی طے ہوا۔

۱۵ اکتوبر کو تقریباً ۲ بجے میں لاہور ائیر پورٹ سے دہلی کے لیے روانہ ہوا۔ ہندوستان اور پاکستان کے مابین باہمی تعلقات کی تاریخ کچھ یوں رہی ہے کہ ہندوستان میں ہر پاکستانی اور پاکستان میں ہر ہندوستانی کو شک کی نگاہ سے دیکھا

جاتا ہے۔ لہٰذا دل میں یہ کھٹک تھی کہ کوئی ناخوشگوار واقع پیش نہ آئے۔ لاہور ائیر پورٹ پر غیر معمولی چیکنگ سے فارغ ہونے کے بعد جب جہاز میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ گنتی کے مسافر تھے۔ جہاز کے اندر بھی سیکورٹی کے آدمی پوری فلائٹ کے دوران چوکس رہے۔ ۵۰ منٹ کی پرواز کے بعد جہاز دہلی ائیر پورٹ پر اُترا۔ دہلی ائیر پورٹ کا عملہ پی آئی اے کا طیارہ اُتر جانے کے بعد کافی چوکنا ہو گیا تھا۔ ہم تمام پاکستانیوں کے ساتھ خصوصی برتاؤ کیا گیا۔ ہر پاکستانی کے لیے ایک فارم بھرنا ضروری تھا۔ جس کے اندر ہندوستان میں قیام کے دوران جائے رہائش وغیرہ کی پوری تفصیلات دینی تھی۔ ائیر پورٹ پر کچھ ہندوستانی صرف اس کام کے لیے مقرر تھے کہ وہ پاکستان سے آئے ہوئے مسافروں کو فارم دیں اور جو خود نہ لکھ سکتے ہوں اُن کے لیے فارم بھی پُر کریں۔ میں نے ایک فارم اُٹھایا ابھی میں اسے بھرنے والا تھا کہ ایک ہندوستانی آیا اور مجھ سے فارم لے کر خود اُسے بھرنے لگا۔ جب اُس نے مجھ سے ویزے کا پوچھا تو میں نے بتایا کہ میں تو سارک سٹیکر پر آیا ہوں۔ اس پر اُس نے ہاتھ روک کر مجھے کہا کہ سارک سٹیکر پر آنے والوں کے لیے الگ جگہ ہے آپ اُدھر چلے جائیں۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے ایک صاحب کے پاس جانے کو کہا کو جو کہ شکل سے سکھ نظر آرہا تھا۔ میں اس کے پاس گیا، اسے اپنا پاسپورٹ دکھایا تو وہ کافی گرم جوشی سے ملا پھر مجھ سے کہنے لگا کہ چونکہ آپ پاکستانی ہیں لہٰذا آپ ہندوستان میں زیادہ سے زیادہ تین شہروں میں جاسکتے ہیں۔ آپ کا پروگرام ایسے ہے کہ اس میں ایک تو روڑکی شہر ہو جائے گا جہاں آپ نے ابھی جانا ہے اور دوسرا دہلی ہو جائے گا جہاں آپ نے اپنے پروگرام کے تحت روانگی سے پہلے دو دن گزارنے ہیں اور اس کے علاوہ ایک اور شہر میں آپ جاسکتے ہیں۔ آپ کہیئے کون سا شہر لکھوں؟۔ پھر میرے

بتانے سے پہلے ہی کہنے لگا کہ اجمیر لکھ دوں۔ میں نے کہا نہیں اگر میرے پاس ایک ہی انتخاب ہے تو میں ضلع مظفر گڑھ جاؤں گا جہاں موضع تھانہ بھون میں میرے روحانی دادا کا مزار ہے۔ اس پر وہ بڑا حیران ہوا اور دو تین بار پوچھا کہ مظفر گڑھ لکھ دوں؟ کیونکہ ایک دفعہ لکھنے کے بعد آپ پھر تبدیل نہیں کر سکیں گے۔ میں نے کہا ہاں لکھ دیں۔ پھر پوچھنے لگا کہ مظفر گڑھ ہے کہاں؟ میں نے کہاں اُتر پردیش یعنی یوپی میں ہے۔ اس لیے اس نے مظفر گڑھ کے ساتھ بریکٹ میں یوپی بھی لکھ دیا جس کا بعد میں مجھے یہ فائدہ ہوا کہ میں نے اتر پردیش میں واقع دوسرے مقامات ، دیوبند ، سہارنپور، گنگوہ وغیرہ بھی بڑے آرام سے دیکھ لیے۔ گو کہ پاکستان واپسی تک کسی نے میرا پاسپورٹ چیک کیا نہ کسی نے پوچھا کہ آپ کدھر سے آئے ہیں۔ لیکن میرے دل کو تسلی تھی کہ چونکہ کاغذ میں یوپی لکھا ہوا ہے اس لیے اگر چیکنگ ہوئی بھی تو انشاءاللہ کوئی مسئلہ نہ ہوگا۔

چیکنگ سے فارغ ہونے کے بعد میں باہر نکلا تو مجھ کو ائیر پورٹ پر وصول کرنے والا آدمی موجود تھا۔ اُس نے مجھے ایک ٹیکسی میں بٹھایا اور کہا کہ یہ ٹیکسی والا آپ کو روڑکی لے جائے گا۔ اور میں یہاں دوسرے مما لک سے آنے والے مہمانوں کا انتظار کروں گا۔ میں نے سامان ٹیکسی میں رکھ دیا اور وہی قریب ہی ایک خالی جگہ پر عصر کی نماز پڑھ لی۔ میرے چھوٹے سے سفری بیگ میں جائے نماز، قطب نما، ایک چھوٹا سا تولیہ اور ایک جوڑا چپل ہوتے ہیں۔ تاکہ جہاں بھی نماز کا وقت آجائے تو وضو کرنے اور نماز میں کوئی دقت نہ ہو۔ نماز سے فارغ ہو کر ٹیکسی میں روانہ ہوئے۔ راستے میں کافی رش تھا۔ بارشوں کی وجہ سے سڑک کی حالت بہت خستہ تھی۔ جگہ جگہ پانی کھڑا تھا اور قدم قدم پر ہمیں رُکنا پڑ رہا تھا۔ دہلی سے نکلتے نکلتے مغرب کی اذانیں

بھی ہوگئی۔ مغرب کی نماز میں نے ایک بس سٹاپ پر پڑھی۔ اس کے بعد دوبارہ روانہ ہوئے۔ میرا خیال تھا کہ دہلی سے نکلنے کے بعد شاید سڑک کی حالت کچھ اچھی ہو لیکن پتہ چلا کہ روڑکی تک یہی حال ہے ڈرائیور نے بتایا کہ ۱۵۰ کلومیٹر کا یہ فاصلہ تقریباً سات گھنٹے لے گا۔ راستے میں ایک جگہ عشاء کی نماز ادا کی اور وہی ہوٹل میں کھانا کھایا۔ اُس کے بعد ٹیکسی کی پچھلی سیٹ میں لیٹ گیا۔ سڑک کی حالت اتنی خراب تھی کہ کبھی کبھار میں باقاعدہ اپنی سیٹ سے اُچھل جاتا تھا۔ رات کے تقریباً ۲ بجے اپنی قیام گاہ پہنچ گیا۔ ہمارا قیام روڑکی یونیورسٹی کے اندر مہمان خانے میں تھا۔ بدھ اور جمعرات کے دو دن صبح سے شام تک تربیتی کورس میں شامل رہے۔ اسی یونیورسٹی کے اندر زلزلوں کی تحقیق کا مشہور ادارہ بھی ہے ۱۹۵۲ء میں نہرو نے ہندوستان میں کئی نامور تحقیقی ادارے قائم کیے جنہیں انڈین انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی یا IIT's کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان اداروں نے ہندوستان کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان اداروں کے فارغ التحصیل لوگوں نے امریکہ اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں اہم عہدوں پر کام کیا اور بعد میں اپنے عہدوں سے فائدہ لیتے ہوئے ہندوستان کے لوگوں کو اُن جگہوں میں داخل کیا۔ جس کا فائدہ اب ہندوستان لے رہا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں پالیسیوں میں تسلسل نہ ہونے اور خاص طور پر محض کام چلانے کی پالیسی نے ملک کو ٹھوس بنیادوں پر کھڑا نہ ہونے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج پاکستان اور ہندوستان کے اکثر شعبوں میں انتہائی فرق ہے۔ اور خاص طور پر آج کل ہندوستان جس رفتار سے اقتصادی ترقی کر رہا ہے اس سے یہ فرق چند سالوں میں مزید وسیع ہو جائے گا۔ ہمارے حکمرانوں نے اگر اب بھی ہوش کے ناخن نہ لیے تو آئندہ چل کر خدانخواستہ ہمارا ملک ہندوستان کی معاشی ترقی میں گم ہی نہ ہو جائے۔ (جاری ہے)

تذکرۂ مشائخ کاندھلہ

(جناب نورالحسن راشد کاندھلوی صاحب)

[ہندوستان پر اللہ کا کرم ہوا اور دینِ اسلام کی روشنی کا پرتو اس پر پڑا۔ شروع شروع میں مسلمان تاجر جو تجارت کی غرض سے ہندوستان کی بندرگاہوں پر آئے۔اُن کی اسلامی پرکشش زندگی سے کئی لوگ مسلمان ہوئے۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں ۳۵ ہجری میں مکران سے لے کر باجوڑ تک کا علاقہ جو اس وقت بدھایہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔صحابہ کرامؓ کے قدموں سے آباد ہوا۔محمد بن قاسمؒ کے ساتھ تو مسلمان عسکری برتری کے ساتھ داخل ہو گئے۔آخر پورا ملک اسلامی حکومت کے زیرِ نگین ہوا۔عرب سے آئے ہوئے خاندان بڑے بڑے شہروں میں آباد ہوئے۔ان شہروں میں بڑے بڑے علمی مراکز بنے اور خانقاہیں آباد ہوئیں۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان نے دہلی میں حدیث کا عظیم مرکز قائم فرمایا۔ حضرت شاہ صاحب فاروقی نسل سے تھے۔ تھانہ بھون کو حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے آباد فرمایا جو فاروقی النسل تھے۔ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا صدیقی خاندان ہندوستان کے مشہور قصبہ کاندھلہ میں آباد ہوا۔مفتی الٰہی بخشؒ،مولانا مظفر حسینؒ،مولان الیاسؒ جیسے عظیم علماء و اولیاء اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ مولانا مظفر حسین صاحبؒ کی کرامات تو بہت مشہور ہیں۔ ذیل میں انہی کا ایک واقعہ ذکر کیا جارہا ہے۔] ادارہ

ہندوستان کے مشہور عالم دین،مرحوم حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی کے دور میں سفر کی سہولتیں بہت کم تھیں۔سفر عموماً پیادہ پا چھکڑوں یا بیلیوں میں ہوا کرتے اور راستے غیر محفوظ اور پرخطر تھے۔ایک دن مولانا کسی ضرورت سے اہل

خاندان کے ہمراہ کاندھلہ سے گنگوہ کے لئے روانہ ہوئے۔اس وقت گنگوہ جانے کے لئے وہ راستہ زیادہ موزوں سمجھا جاتا جو موضع گڑھی پختہ سے ہوکر جاتا تھا۔مولانا کا قافلہ گڑھی سے نکل کر گنگوہ کے راستے میں تھا کہ اچانک اسے ڈاکوؤں نے گھیر لیا۔مولانا نے جب دیکھا کہ وہ ڈاکوؤں کے نرغے میں آگئے ہیں جو حملہ کرنے، مارنے اور لوٹنے کے لئے تیار ہیں۔تو حضرت گاڑی سے اتر کر ڈاکوؤں کے سردار کے پاس گئے اور اس سے فرمایا:'اپنا کام کرنے سے پہلے میری ایک بات سن لو'سردار نے کہا'کہو! کیا کہنا چاہتے ہو؟' مولانا نے فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ تمہارے ساتھ ایک معاملہ کروں'ڈاکوؤں کے سردار نے اس کی تفصیل پوچھی'تو مولانا نے کہا: تم ہماری عورتوں کو مت چھیڑنا، ہاتھ بھی نہ لگانا، ہم اپنے پاس کوئی زیور، روپیہ پیسہ اور قیمتی سامان نہیں رکھیں گے۔سب تمہیں دے دیں گے' ڈاکوؤں کے ہدایت و اصلاح کا وقت آچکا تھا، سردار نے مولانا کی یہ فرمائش قبول کرلی۔اب ڈاکوؤں کا گروہ ایک طرف بیٹھ گیا۔مولانا اپنی گاڑیوں (بہلیوں یا چھکڑے) کے پاس آئے اور سب عورتوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ جس کے پاس جو زیور اور قیمتی سامان ہو وہ دے دو۔عورتیں اور لڑکیاں اپنے اپنے زیورات اتارنے اور پیسے وغیرہ نکالنے لگیں۔مولانا کھڑے ہوکر ان کی نگرانی فرماتے رہے۔جب سب زیورات وغیرہ جمع ہو گئے تو مولاناؒ انہیں ایک کپڑے میں باندھ کر ڈاکوؤں کے پاس لائے اور کہا'بھائی! دیکھو میں سب سامان لے آیا ہوں' یہ کہہ کر گٹھڑی ان کے حوالے کردی اور ڈاکوؤں کی اس بات پر تحسین فرمائی کہ انہوں نے اپنی بات کو نبھایا اور کسی عورت کو دیکھا تک نہیں۔ڈاکوؤں سامان لے کر خوش ہو گئے اور مولاناؒ کا قافلہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔قافلہ کچھ دور ہی چلا تھا کہ عورتوں میں کچھ کھسر پھسر شروع ہوئی۔حضرت مولاناؒ نے

اسے محسوس کرلیا اور پوچھا کیا بات ہے؟' عورتوں نے کہا کہ کچھ نہیں، مگر جب مولانا ؒ نے سختی سے پوچھا تو بتایا 'وہ فلاں لڑکی یہ کہہ رہی ہے کہ اس کی ہنسلی (گلے میں پہننے کا ایک زیور جو خاصا بھاری اور قیمتی ہوتا ہے) بچ گئی۔ اس نے کپڑوں کے نیچے چھپالی تھی۔' مولاناؒ نے یہ بات سنی تو فوراً سواری روکنے کی ہدایت کی۔ گاڑی سے اتر کر مولاناؒ اس لڑکی کے پاس گئے اور فرمایا 'بی بی! یہ تو وعدہ خلافی، چوں کہ ہم ڈاکوؤں سے وعدہ اور معاہدہ کر چکے ہیں، اس لئے یہ زیور ان کا ہو چکا۔ لاؤ مجھے دو، میں ڈاکوؤں کو دے آؤں۔' لڑکی نے اپنا زیور اتار کر مولاناؒ کے حوالے کر دیا۔ مولاناؒ گاڑی سے اتر کر واپس گئے اور وہاں پہنچے جہاں ڈاکوؤں کا گروہ ٹھہرا ہوا تھا۔ ڈاکو مولاناؒ کو واپس آتا دیکھ کر یہ سمجھے کہ شاید بڑے میاں (مولانا) کے معاون و مددگار آ گئے اور اب وہ مقابلہ کریں گے۔ اس خیال سے وہ ہتھیار اٹھانے لگے۔ یہ دیکھ کر مولاناؒ نے فرمایا: 'میں لڑنے نہیں آیا، تمہاری امانت لوٹانے آیا ہوں۔' مولاناؒ یہ فرمانے کے بعد ڈاکوؤں کے سردار کے پاس پہنچے اور اس سے مخاطب ہو کر فرمایا 'بھائی! میں تم سے معافی مانگنے اور تمہاری ایک امانت واپس کرنے آیا ہوں۔ تم اپنے وعدے اور بات کے سچے نکلے، ہم نہ نکلے، یہ زیور لے لو جو ایک بچی نے اپنے کپڑوں میں چھپا لیا تھا۔ چوں کہ تمہارے ساتھ وعدہ ہو چکا تھا، اس لئے اب ہمارا نہیں رہا، تمہارا ہے، میں یہی دینے آیا تھا۔ یہ زیور سنبھالو اور اس بچی کی غلطی معاف کر دو۔' ڈاکوؤں کا سردار مولاناؒ کی بات سن کر بولا 'تم مولوی مظفر حسین کاندھلوی تو نہیں ہو، اس علاقے میں وہی ایک ایسے سچے آدمی ہیں۔' مولاناؒ نے فرمایا: 'ہاں بھائی، مظفر حسین میرا ہی نام ہے۔'

باقی صفحہ ۴۶ پر

بچوں کی تعلیم و تربیت کے مدارج اور اس کے طریقے

(کتاب 'اصلاح خواتین' سے محمد قسیم شاہ کا انتخاب)

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ابتدائے عمر میں بچہ کو سمجھ ہی کیا ہوتی ہے جو وہ اچھی یا بری بات کا اثر لے۔ بچپن میں ان کی تربیت کرنے والا (پڑھانے والا) خواہ کیسا اور کوئی بھی ہو ہاں سمجھ آجانے کے بعد کسی نیک آدمی کے رکھنے کی ضرورت ہونی چاہئے۔ سو خوب سمجھ لیجئے کہ یہ خیال غلط ہے۔ بچپن میں جبکہ بچہ دودھ پیتا ہے، اس وقت بھی اس کے دماغ میں اخذ کا مادہ ہوتا ہے۔ (یعنی کسی بات کا اثر قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے) اگرچہ وہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکے۔ ابتدائی عمر میں بھی وہ سب باتوں کو اخذ کر کے محفوظ کر لیتا ہے۔ گو اس وقت ان پر عمل نہ کر سکے یا زبان سے ظاہر نہ کر سکے۔ پھر جب اس میں بولنے اور عمل کرنے کی پوری طاقت ہو جاتی ہے تو پہلی باتوں کے آثار اس سے ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ (الکمال فی الدین النساء) چار پانچ سال کی عمر میں بچہ میں اچھی یا بری عادتیں پختہ ہو جاتی ہیں۔ جب بچہ بڑا ہو جائے تو اس کو دین کی تعلیم سکھاؤ اور خلاف شریعت کاموں سے بچاؤ اور نیک لوگوں کی صحبت میں رکھو۔ برے لوگوں کی صحبت سے بچاؤ۔ غرض جس طرح بزرگوں نے لکھا ہے۔ اس طرح بچوں کی تعلیم کا اہتمام کرو۔ بعض عورتیں اس میں بہت کوتاہی کرتی ہیں۔ بچوں کے اخلاق کی درستگی زیادہ تر عورتوں ہی کے اہتمام کرنے سے ہو سکتی ہے۔ کیونکہ بچے شروع میں زیادہ عورتوں کے پاس ہی رہتے ہیں۔ اولاد کے یہ حقوق صرف عورتوں کے ذمہ نہیں بلکہ مردوں کے بھی ذمہ ہیں۔ اکثر لوگ بچپن میں تربیت کا اہتمام نہیں کرتے۔ یوں کہہ دیتے ہیں کہ ابھی بچے ہیں۔ حالانکہ بچپن ہی کی عادتیں پختہ ہو جاتی ہے۔ جیسے عادات ڈالی جاتی ہے، وہ آخر تک ہوتی ہیں اور یہی وقت ہے اخلاق کی درستگی اور

خیالات کی پختگی کا۔ بچپن کا علم ایسا پختہ ہوتا ہے کہ کبھی نہیں نکلتا الا ما شآء اللّٰہ . چنانچہ بچہ شروع میں ماں باپ کی گود میں رہتا ہے اور انہی کو ماں باپ سمجھتا ہے۔ بعد میں اگر کوئی شک ڈالے کہ یہ تمہارے ماں باپ نہیں ہیں۔ خواہ کتنے ہی لوگ شک ڈالنے والے ہوں تو کبھی شک نہ ہوگا۔ یہ ہے بچپن کے خیالات کی پختگی۔ (حسن العزیز)

اصل ضرورت علم دین کی ہے، اب اس کی فہرست بتلاتا ہوں۔

۱۔ سب سے پہلے بچہ کو کلمہ شریف سکھا دو، خواہ ایک ہی کلمہ ہو جس کو عورتیں بہت آسانی سے سکھا سکتی ہیں۔

۲۔ نیز بچہ کو احکام کی زبانی تعلیم بھی دیتی رہو۔ مثلاً اللہ سے دعا مانگنا، اور یہ کہ اللہ ہی رزق دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات کی جو صفات ہیں، وہ بتلاؤ مثلاً سب چیزوں کو انہوں نے ہی پیدا کیا۔ وہی چلاتے ہیں، ان کو تمام چیزوں کی خبر ہے۔ اگر بچہ شرارت کرے تو کہو کہ اللہ میاں ناراض وخفا ہوں گے۔ اور جو علوم ان کے مناسب ہیں۔ عورتیں ان کے ذہن میں خوب ڈال سکتی ہیں۔ بار بار کہتے رہنے سے بچے کو یقین ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کو سب چیز کی خبر ہے۔ عورتوں کو چاہئے کہ ان کے خیالات درست کریں۔

۳۔ اس کے بعد جب ہوش ہو تو چھوٹی سورتیں، قرآن شریف کی یاد کرا دیں۔

۴۔ جب سات برس کے ہوں تو نماز پڑھنے کا طریقہ بتلا دیں اور دس برس کی عمر میں مار کر پڑھوائیں۔ لیکن ان کو نماز کے بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں کہتا۔ اگر کوئی بچہ امتحان میں فیل ہو جائے تو اس پر افسوس ہوتا ہے۔ لیکن نماز سال بھی نہ پڑھے تو ذرا بھی افسوس نہیں ہوتا۔ اسلام زبانِ حال سے شکایت کر رہا ہے کہ افسوس میری طرف بالکل توجہ نہیں رہی۔ میں تم کو غیرت دلاتا ہوں کہ یہ بتلائیں کہ اس کی حفاظت آپ کے ذمہ ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کیوں نہیں کی جاتی؟ (باقی صفحہ آخر پر)

فنا فی المال۔ ھائے پیسہ وائے پیسہ (قسط۔۱۰)

(ڈاکٹر فہیم شاہ صاحب، اسسٹنٹ پروفیسر آف میڈیسن، کوہاٹ میڈیکل کالج)

ایک دفعہ میں گاؤں گیا۔ ایک عورت کو میرے آنے کی معلومات ہوئیں تو اپنی بیماری کی کہانی مجھے سنانے کے لئے پہنچ گئی۔ ان کے ہاتھ میں کاغذ تھے جو مختلف ڈاکٹروں کے نسخے ہوتے تھے اور ساتھ مختلف ٹسٹ۔ ان کاغذوں کے علاوہ لفافے میں دوائیاں بھی تھیں۔ میں نے اس کی بیماری کے متعلق اس سے معلومات لیں۔ ان نسخہ جات کو دیکھنے کے بعد اپنا نسخہ لکھنے لگا تو اس عورت نے ایک انجکشن لفافے میں سے نکال کر مجھے دکھایا کہ یہ مجھے فلانے ڈاکٹر صاحب نے اپنی کلینک میں ہی لگایا تھا اور میرے ساتھ دو اور عورتوں کو بھی اپنی باری پر لگایا۔ میں آنکھ بچا کر وہ انجکشن تمہیں دکھانے لے آئی ہوں کہ اس انجکشن کا میری بیماری کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ اور یہ مجھے اور باقی مریضوں کو کیوں لگایا ہے؟ میں نے جب انجکشن ہاتھ میں لے کر دیکھا تو وہ Steroid کا انجکشن تھا جو بعض خصوصی حالات میں استعمال ہوتا ہے لیکن اس کا عمومی استعمال عام ڈسپنسر لوگ، لوگوں کو وقتی فائدہ دینے کے لئے اپنی نجی پریکٹس میں استعمال کرتے ہیں۔ اس سے مریض میں علامات بیماری وقتی طور پر ختم ہو جاتی ہیں اور مریض خوش ہو جاتا ہے۔ اس کا زیادہ استعمال کافی جسمانی نقصان کا باعث بنتا ہے۔ میں نے اس مریضہ کو تسلی دی کہ یہ انجکشن بعض ڈاکٹر ہڈیوں کے درد وغیرہ کے لئے مریض کو جلدی ٹھیک کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ایک انجکشن تو خیر لگا لیا لیکن اس کو آئندہ کبھی نہیں لگانا جب تک کوئی مستند ڈاکٹر تجویز نہ کرے۔ اس انجکشن سے انسان چونکہ بہتری محسوس کرتا ہے اس لئے اس کا اثر ختم ہوتے ہی وہ دوبارہ اس کی خواہش کرتا ہے۔ یہ انجکشن پھر عموماً ایسے لوگ نسخے میں نہیں لکھتے کہ کوئی دوسرا ڈاکٹر

دیکھ کر حقیقتِ حال نہ بتا دے۔ عورت سے میں نے کہا آپ پریشان نہ ہوں۔ میں نے اس کو سمجھا کر رخصت کر دیا۔ لیکن حقیقتِ حال یہ تھی کہ یہ انجکشن مریض کی تعداد میں اضافہ کا باعث بنا کرتا ہے۔ اگر Steroid کی گولی اور انجکشن ہڈیوں، پٹھوں اور جملہ باقی خاص بیماریوں میں استعمال ہو تو مریض اپنی علامات میں بہتری پانے کے بعد باقی مریضوں کو اس ڈاکٹر سے رجوع کرنے کا کہتا ہے۔ یوں مریضوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ میں نے کافی ڈاکٹروں کے نسخے دیکھے جن میں اس قسم کی ادویات لکھی جاتی ہیں یا تو ظاہری نام سے یا مخفف استعمال کر کے لکھی جاتی ہیں جسے باہر بیٹھے ادویات والے یا ڈاکٹر کا اردلی بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔ بعض مخصوص حالات اور مخصوص بیماری میں اس کا استعمال ضروری ہے لیکن ہر بیماری کیلئے نہیں۔ مقصد چونکہ خدمت خلق کی بجائے پیسے بٹورنا ہوتا ہے اور اِلہٰ روپے ہوتا ہے اس لئے عمومی طور پر گاؤں اور محلوں میں ادویات والے، ڈسپنسر حضرات اپنی دکان چمکانے کے لئے اس قسم کے حربے استعمال کر کے اپنی آخرت کو تباہ کرتے ہی ہیں لیکن ان کی تنگدستی میں کمی پھر بھی نہیں آتی۔ اس لئے اگر وہ آج دس ہزار کمائیں یا ایک لاکھ کمائیں، پھر بھی اللہ تعالیٰ ان کی ضروریات کو بیس ہزار یا دو لاکھ بنا کر دکھاتے ہیں۔ تو بجائے وہ خوشحال ہونے کے دس ہزار یا ایک لاکھ کے مقروض ہی رہتے ہیں۔ اگلے دن پھر وہ صبح سے اس نیت سے نکلتے ہیں کہ آج اتنا، اتنا کماؤں گا۔ یہ لوگ تو شیطان کی راہ پر چلنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو تفکرات میں گھیرے رکھتے ہیں۔ وہ اپنے مال کو بڑھانے کی فکر میں اپنی زندگی اجیرن بنا دیتے ہیں۔

ایک دن سرکار دو عالم ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ اچانک ان کی نظر ایک ہٹے کٹے جوان پر پڑی جو طلب معاش کے لئے محنت کرنے میں

مصروف تھا۔ بعض صحابہ نے کہا : افسوس صد افسوس یہ اس کام میں مشغول ہے ، کاش !اس کی جوانی اور طاقت راہِ خدا میں کام آتی ۔سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا: ایسا مت کہو یہ شخص اگر دستِ سوال دراز کرنے کی ذلت سے بچنے کے لئے اور لوگوں سے بے نیاز ہونے کے لئے محنت کر رہا ہے تو راہِ خدا میں ہے، اور اگر یہ شخص اپنے ضعیف و ناتواں والدین اور بے کس و مجبور بچوں کے لئے محنت میں مصروف ہے تو راہِ خدا میں ہے۔ ہاں اگر وہ مال کی کثرت اور دوسروں پر مفاخرت کے لئے محنت کر رہا ہے تو راہِ خدا میں نہیں ہے بلکہ شیطان کی راہ پر چل رہا ہے۔

(الطبرانی فی المعاجم الثلاثہ،کعب ابن حجرہؓ از احیاء العلوم ص ۱۰۵ جلد دوم)

ایک حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے' جو شخص حلال طریقے پر مانگنے سے بچتے ہوئے اپنے اہل و عیال کے لئے جدو جہد اور اپنے پڑوسی پر مہربانی کے نقطہ نظر سے دنیا طلب کرے تو وہ چودھویں رات کے چاند کی طرح حسین چہرے کے ساتھ باری تعالیٰ سے ملاقات کرے گا۔

(بیہقی شعب الاایمان ۔ابو ہریرہؓ از احیاء العلوم ص ۱۰۵ جلد دوم)

اپنی نیت کا درست کرنا ضروری ہے کہ میں روزانہ صبح اپنے کاروبار کے لئے کس نیت سے جاتا ہوں۔ امام غزالیؒ احیاء العلوم میں تجارت میں نیت کی اصلاح کے تحت لکھتے ہیں کہ تاجر کو چاہیئے کہ وہ تجارت کو ذریعہ فخر و مباہات نہ سمجھے بلکہ یہ نیت کرے کہ میں لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے سے بچنے کے لئے حلال رزق کی خاطر مال کے ذریعے دین پر استقامت حاصل کرنے کے لئے اور بیوی بچوں کے حقوق کی ادائیگی کے لئے تجارت کر رہا ہوں۔ مسلمان کے لئے خیر خواہی کی نیت بھی رکھے اور تمام انسانوں کے لئے وہی چیز پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہو اور

ہر معاملے میں عدل اور احسان کے تقاضوں کی تکمیل کرے۔ بازار میں اس کی حیثیت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض ادا کرنے والے کی ہونی چاہئے۔ اگر اس نیت میں کامیابی حاصل کر لی اور اس کے مطابق عمل بھی کیا تو وہ راہِ آخرت کا مسافر ہے۔ کامیاب ہوا تو دنیا کا نفع بھی ملے گا اور آخرت کا نفع بھی، ناکام ہوا تو یہ ایک عارضی ناکامی ہوگی۔ آخرت کی فلاح اور سرخروئی اس کا مقدر بنے گی۔

(از احیاء العلوم جلد دوم ص ۱۳۸)

جس دن تاجر، ڈاکٹر یا باقی لوگ خوب مال کمالیں اور گھر لوٹتے ہوئے جیب میں پیسے اپنے مقررہ ہدف کے مطابق ہوں تو چہرے پر مسکراہٹ خود ہی پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ ہنسی مزاح گھر کے افراد کے ساتھ خوب ہوتا ہے، باقی ملنے والے بھی اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن جس دن پیسے اپنے مقررہ ہدف سے کم ہوں تو ماتھے پر بارہ بجے ہوتے ہیں۔ کھانا مزیدار ہونے کے باوجود بے ذائقہ معلوم ہوتا ہے، بچوں کا شور برا معلوم ہوتا ہے، گھر کے افراد کی باتیں بری معلوم ہوتی ہیں۔ لوگ ملنے آئیں تو دل ہوتا ہے کہ جلدی سے جان چھوڑیں۔ چونکہ پیسے میں جان ہے، پیسہ ہی خوشی دیتا ہے اور پیسے کی کمی ہی خوشی کو غمی میں تبدیل کر دیتی ہے۔ ایک ڈاکٹر صاحب نے باہر ملک میں کچھ وقت گزارنے کے بعد پشاور کے خوش پوش علاقے میں اپنے کلینک کا آغاز کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر فضل کیا، اس کا کلینک چل پڑا۔ ساتھ ساتھ اپنے کلینک میں توسیع کرتا گیا۔ میرا بھائی جب اپنی ڈاکٹری تعلیم سے فارغ ہوا تو شام تجربہ حاصل کرنے کے لئے اس ڈاکٹر صاحب کے پاس آنے جانے لگا۔ اس کلینک میں چار پانچ کمرے تھے، ہر کمرے میں کلینک کا سامان اپنے معیار کے مطابق علیحدہ علیحدہ تھا۔ ایک کمرے سے ڈاکٹر مریض سے فارغ ہوتا تو دوسرے کمرے میں مریض تیار ہوتا

تھا۔اس ڈاکٹر نے میرے بھائی سے کہا کہ ان کمروں میں جو مریض عام ہوا کریں وہ تم جا کے دیکھ لیا کرو۔تا کہ تمہارے تجربہ میں اضافہ ہو۔بھائی کا بیان ہے کہ ایک دن میں ایک مریض سے فارغ ہوا،عصر کی نماز ایک کمرے میں پڑھنے کے لئے گیا۔چونکہ ہم دونوں کے لئے جائے نماز ایک ہی تھا،اس لئے میں پہلے پہنچ کر نماز شروع کرنے ہی والا تھا کہ وہ ڈاکٹر صاحب بھی پہنچ گئے۔چہرہ خوشی کی وجہ سے کھلا ہوا تھا،میرے طرف آتے ہی کہنے لگے کہ 'امجدہ چینیا نو کار اُکو' ڈاکٹر امجد چینی لوگوں نے کام کر دیا ہے' میرے پاس آ کر نماز پڑھنے کے انتظار میں بیٹھتے ہی پھر وہی جملہ کہا کہ امجدہ چینیا نو کار اُکو' میں حیران تھا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔تیسری دفعہ پھر یہی گردان کی کہ امجدہ چینیا نو کار اُکو' ۔میں نماز کی نیت باندھ کر نماز پڑھنے لگا۔نماز پڑھ کر فارغ ہوا تو اس نے جائے نماز پر آ کر نیت باندھنے سے پہلے پھر مجھے مخاطب ہو کر کہا کہ امجدہ چینیا نو کار اُکو ' مجھے حیران چھوڑ کر وہ اپنی نماز پڑھنے لگا۔نماز میں بھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔سلام پھیرنے کے بعد پہلا جملہ پھر یہی تھا کہ'امجدہ چینیا نو کار اُکو '۔میں نے پوچھا سر یہ کیا معاملہ ہے؟ کہنے لگا کچھ چینی سفات کار آئے تھے اپنے دانتوں کے علاج کے لئے۔ان کا معائنہ کرنے بعد آئندہ کی تاریخ دینے کے ساتھ ان کے پیسوں کا حساب بھی جو ان کا بنتا تھا،ان کو سمجھا دیا۔ان کے پیسے ساٹھ ہزار بنتے ہیں (یہ ۱۹۹۲ کی بات ہے) جس کی وجہ سے میرا دل خوشی محسوس کر رہا ہے کہ اب میرا کام بن جائے گا۔اس لئے بار بار تذکرہ ان کا ہو رہا ہے۔بھائی کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا کہ اس دن ڈاکٹر صاحب بہت خوش تھے۔آج بھی اس جملہ کے یاد آنے سے اس ڈاکٹر کے چہرے پر پھیلے خوشی کے تاثرات سامنے آجاتے ہیں۔

ہائے پیسہ وائی پیسہ، ہائے پیسہ وائی پیسہ بس یہی گردان میری اور آپ کی ہے۔ آئے تو انسان خوش ہو، جائے تو غمزدہ۔ مال سے محبت طبعی امر ہے۔ دل کا کچھ نہ کچھ خوش ہونا طبعی چیز ہے لیکن اتنی خوشی ہو کہ اس کی گردان شروع ہو جائے۔ نماز میں بھی اسی کا خیال۔ لوگوں سے خوشی خوشی مل رہا ہوں اور اگر انقصان ہو جائے تو سارا گھر اور ارد گرد کا ماحول عذاب بن جائے، یہ مذموم ہے اور بری بات ہے۔ حضرت تھانویؒ نے ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ مال سے محبت ہونا طبعی بات ہے۔ شیخ احمد دحلان نے فتوحات اسلامیہ میں لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے سامنے بعد فتح فارس جب خزائن لائے گئے تو انہوں نے جناب باری تعالیٰ میں عرض کیا کہ اے اللہ ہم اس کی تو دعا نہیں کرتے کہ اس کی محبت ہمارے دل سے نکل جائے کیونکہ یہ تو آپ کی پیدا کی ہوئی ہے۔ **کما قال اللّٰہ تعالیٰ زین للناس حب الشھوات** الخ) ہاں اس کی دعا ہے کہ اس مال کی محبت آپ کی محبت میں معین ہو اور اس کا معیار یہ ہے کہ اگر ایسا کوئی موقع ہو کہ مال خرچ کرنے میں اللہ و رسول کی مرضی حاصل ہوتی ہو اور صرف نہ کیا جائے تو یہ محبت خود ذات مال سے ہے اور ناپسندیدہ ہے اور اگر صرف کیا جائے تو اس کو ذات مال کی محبت نہ کہیں گے۔ (ملفوظات حکیم الامت جلد۲ ص ۳۳۰) ایک سلسلہ گفتگو میں حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ بعض لوگوں کو تو ضروریات کی وجہ سے روپیہ کی تلاش ہوتی ہے۔ اگر ضروریات پوری ہوتی رہیں تو ساری عمر روپیہ کی صورت بھی دیکھنا پسند نہ کریں۔ اور بعض کو خود روپیہ کی ذات سے تعلق ہوتا ہے مگر یہ ایک مرض ہے۔ ان کو خود روپیہ سے حِظ (مزہ) مقصود ہوتا ہے کہ میں اتنے روپیہ کا مالک ہوں۔ روپیہ سے تعلق اور حظ پر ایک بنئے کی حکایت یاد آئی۔ ایک دوست نے بیان کی تھی۔ کہ وہ بیمار تھا۔ روپیہ کثرت سے پاس تھا مگر علاج نہ کرتا

تھا۔ دوست احباب کے زور دینے پر بمشکل علاج پر آمادہ ہوا مگر اس طرح کہ لوگوں سے پوچھا پہلے علاج کا تخمینہ کرالو کتنا خرچ ہوگا۔ چنانچہ تخمینہ کرلیا گیا۔ طبیب کو بلا کر نبض دکھلائی، نسخہ تجویز ہوا۔ مدت استعمال کا تخمینہ ہوا قیمت کی تحقیق کی گئی اور حساب لگا کر بتلایا کہ اس قدر صرف ہوگا کہ اب یہ دیکھو کہ مرنے پر کیا صرف ہوگا، وہ بتلایا گیا کہ اس قدر صرف ہوگا۔ تو کہتا ہے کہ بس اب تو یہی رائے ہوتی ہے کہ مر جاویں کیونکہ علاج میں روپیہ زائد صرف ہوگا اور مرنے میں کم۔

ایک مولوی صاحب کے جواب میں حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ تجربہ ہے کہ روپیہ بدون بخل کے جمع نہیں ہوسکتا۔ اس لئے تھوڑی سی صفت بخل ہر شخص میں ہونے کی ضرورت ہے مگر یہ بخل لغوی ہوگا شرعی نہ ہوگا۔ جیسے رات کو کوئی سفر کرے تو اس میں اتنا خوف ہونا ضروری ہے کہ اپنے مال کی حفاظت کر سکے۔ یہ ظاہر ہے کہ سخاوت محمود چیز ہے مگر معصیت میں صرف کرنا گو لغۃً یہ بھی سخاوت ہی ہے مگر شرعاً مذموم ہے۔ روزہ عید کے دن محمود نہیں۔ سوتے وقت جب کہ نیند کا غلبہ ہو اور الفاظ غلط نکلنے لگیں، ذکر اللہ منع کیا گیا ہے، تو یہ ذکر بھی اس وقت محمود نہ ہوگا۔ ہاں ایمان ایک ایسی چیز ہے کہ جو ہر وقت اور ہر ساعت میں محمود ہے۔ غرض خشیت میں، شوق میں، بخل میں، سخاوت میں، عداوت میں، دوستی میں ہر شعبے میں حدود کی ضرورت ہے۔

(از ملفوظات حکیم الامت جلد ۶ ص ۱۸۵۔۱۸۶)

روپیہ پیسہ اگر زیادہ آئے تو ہر کوئی خوشی کا اظہار کرتا ہے اور اگر کم آئے تو خفا ہوتا ہے۔ حالانکہ زیادہ بھی اگر اللہ کی طرف سے ہے تو کم بھی اللہ کی طرف سے ہے۔ جس دن ہماری دھیاڑی (دن کی آمدنی) کم ہو اس دن ہمارے چہرے کے تاثرات دیکھنے والے ہوتے ہیں۔ حالانکہ اس دن زیادہ خوش ہونا چاہیئے۔ حضرت تھانویؒ

فرماتے ہیں 'تھوڑی رقم بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔ بعض لوگ چھوٹی رقم کو حقیر سمجھتے ہیں، اس کے ملنے سے خوش نہیں ہوتے۔ چھوٹی رقم نہ ہونے سے بھی پریشانی ہو سکتی ہے۔ ایک مرتبہ خواجہ صاحبؒ سفر میں تھے، اسٹیشن سہارنپور پر ٹکٹ خریدنے کا ارادہ کیا تو ایک پیسہ کی کمی تھی۔ اب کیا کریں مانگ کسی سے سکتے نہیں۔ ملنے والا کوئی پاس نہیں، مدرسہ اسٹیشن سے دور اور نوکری پر حاضری اسی ٹرین سے سوار ہونے پر موقوف۔ اتفاق سے ان کے جیب میں ایک پوسٹ کارڈ نکل آیا، اس زمانے میں کارڈ کی قیمت ایک پیسہ تھی۔ اس کو فروخت کرنے کے لئے مسافروں سے التجا کی۔ کسی کو رحم آ گیا، خرید لیا ورنہ ایک پیسہ بدون سارا کرایہ بیکار تھا۔ خواجہ صاحبؒ کہتے تھے کہ اس روز معلوم ہوا کہ پیسہ بھی خدا کی بڑی نعمت ہے۔ (از ملفوظات حکیم الامت جلد ۸ ص ۳۳۶)

حضرت نوفل بن ایاس ہذلیؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ ہمارے ہم مجلس تھے اور بڑے اچھے ہم مجلس تھے۔ ایک دن ہمیں اپنے گھر لے گئے۔ ہم ان کے گھر میں داخل ہو گئے، پھر وہ اندر گئے اور غسل کر کے باہر آئے اور ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ پھر اندر سے ایک پیالہ آیا جس میں روٹی اور گوشت تھا۔ جب وہ پیالہ سامنے رکھا گیا تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ رو پڑے۔ ہم لوگوں نے ان سے کہا اے ابو محمدؓ! (یہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی کنیت تھی) آپ کیوں رو رہے ہیں؟ انہوں نے کہا حضور ﷺ دنیا سے اس حال میں تشریف لے گئے کہ آپ نے اور آپ کے گھر والوں نے کبھی جو کی روٹی پیٹ بھر کر نہیں کھائی۔ اس لئے میرے خیال میں یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ نے ہمیں جو دنیا میں زندہ رکھا ہے اور دنیا کی وسعت ہمیں عطا فرمائی ہے، ہماری یہ حالت حضور ﷺ کی حالت سے بہتر ہو اور ہمارے لئے اس میں خیر زیادہ ہو۔ (حیاۃ الصحابہؓ جلد دوم ص ۳۴۷)

ایک مریضہ اپنے خاوند کے ساتھ میرے پاس آئی۔ اس کی بیماری کی اصل وجہ دل کی کڑھن (Tension) تھی۔ دنیا کی محبت چونکہ ہر غریب اور امیر میں بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔ اس عورت کے الفاظ بعد اس کے معائنے کے جو سنے تو حیرت ہوئی۔ اس کا کہنا تھا کہ ساری مصیبتیں پیسے نہ ہونے کی وجہ سے ہم پر آ رہی ہیں۔ دیکھو نا میں کتنی بیمار ہوں لیکن پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے علاج نہیں کر سکتی۔ خاوند بیچارہ سارا دن دکان پر گزارتا ہے، اتنا کما کر نہیں لاتا جس سے دن رات سکون کے گزریں۔ میری بیماری میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے، غربت کی وجہ سے۔ میں نے چند سوالات اس سے پوچھے کہ بی بی آپ کو گھر میں دو وقت کی روٹی مل جاتی ہے؟ اس نے جواب دیا ہاں دو کے بجائے تین وقت کھاتے ہیں۔ میں نے پوچھا گھر میں فریج اور مشین کپڑے دھونے کی ہے؟ اس نے کہا ہاں ہے، یہ تو ضروری چیزیں ہیں۔ میں نے پوچھا گھر میں بجلی ہے جس سے ٹھنڈی ہوا پنکھے کے ذریعے ملتی ہو۔ اس نے کہا کہ الحمد اللہ! یہ بھی ہے۔ میں نے مزید اس طرح پوچھ کر کہا کہ بی بی آپ تو غریب نہیں ہیں، ماشاء اللہ ضرورت کی چیزوں سے زائد چیزیں گھر میں رکھی ہوئی ہیں۔ یہ گلہ اللہ میاں سے کہ ہم ہی غریب ہیں، یہ تو سراسر زیادتی ہے۔ اگر آپ نے کبھی پیٹ پر پتھر باندھا ہوتا یا آپ کے گھر میں تین تین مہینے بغیر چولہا جلائے گزر جاتے تو ہم یہ سمجھتے کہ شائد آپ پر فاقے ہیں اور آپ مفلس و نادار ہیں۔ آجکل کی سہولتیں تو شائد پہلے بادشاہوں کو بھی میسر نہیں تھیں۔ گھر بھی موجود، بچے بھی موجود، خاوند کما کر لانے والا موجود، پھر بھی آپ غریب ہونے کا دعویٰ کر رہی ہیں۔ یہ سب خرافات ہیں۔ آپ اصل میں اڑوس پڑوس کے لوگوں کی بہتر مالی حالت کو سامنے رکھ کر ناشکری کرتی ہیں۔ آپ کی مرض کی وجہ ہی اصل میں دنیا سے محبت اور تھوڑے پر قناعت نہ کرنا ہے۔ اپنے آپ کو

ڈاکٹروں سے بچانے کا طریقہ ہی یہی ہے کہ دل کا کڑھنا چھوڑ دیں۔ آپ میں ظاہراً کوئی بیماری نہیں ہے سوائے ہائے پیسہ وائی پیسہ کے۔ میری اس بات کو سن کر اس کا خاوند مسکرانے لگا اور کہنے لگا کہ ڈاکٹر صاحب آپ نے بالکل درست بات کہی۔ جب بھی میں گھر تھکا تھکایا آتا ہوں، یہ آگے سے اپنی فرمائشیں لئے ہوئی بیٹھی ہوتی ہے۔ اس کے منہ سے میں نے کبھی شکر کا کلمہ نہیں سنا۔ کبھی کہتی ہے کہ فلانے گھر میں یہ ہے اور فلانے کے پاس یہ ہے، تم یہ نہیں کرتے اور وہ نہیں کرتے۔ اس کے سر کا درد بھی شائد ان باتوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اوروں کا مقابلہ اس کے دماغ میں بیٹھا ہوا ہے۔ میرے سارے پیسے یہ ادھر ادھر اور اپنی بیماری پر لگا دیتی ہے۔ میں نے دیکھا کہ شوہر آہستہ آہستہ غصے میں ہوتا جا رہا ہے۔ شائد آج پہلا موقع تھا کہ دل کی باتیں کھل کر کہہ رہا تھا۔ میں نے اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے دو تین جملے کہے۔ پھر ان کو اپنی زندگی اسلامی اصولوں پر گزارنے کا کہہ کر رخصت کر دیا۔ حضرت تھانوی ؒ نے فرمایا کہ عورتوں میں چونکہ ناشکری کا مادہ زیادہ ہے اس لئے ان کو تھوڑے سامان پر قناعت نہیں ہوتی۔ ان کو دنیا کی تکمیل کی بہت زیادہ فکر ہے، ہر وقت اسی دھن میں رہتی ہیں۔ ان کی ہوس کبھی پوری نہیں ہوتی۔ مردوں کے نزدیک تو ضرورت کا درجہ یہ ہے کہ جس کے بغیر تکلیف ہو۔ سو اتنا سامان تو اکثر متوسط الحال (درمیانے قسم کے) لوگوں میں بحمداللہ موجود ہوتا ہی ہے۔ اس لئے مردوں کو اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ ہاں اگر خدا وسعت دے تو اس کا مضائقہ نہیں۔ اتنا سامان جمع کر لیا جائے جس سے زیادہ راحت نصیب ہو۔ یہ درجہ مردوں کے نزدیک کمال کا مرتبہ ہے۔ مگر عورتوں کے نزدیک ضرورت کا درجہ کوئی چیز نہیں، مرد جس کو ضرورت سمجھتے ہیں، وہ عورتوں کے نزدیک قلت اور تنگی کا درجہ ہے۔ ان کے نزدیک ضرورت کا درجہ وہ ہے جس کو مرد

کمال کا درجہ سمجھتے ہیں۔اور کمال کا درجہ وہ جو حقیقت میں ہوس کا درجہ ہے اور اس کا سبب یہ کہ عورتوں میں ناشکری زیادہ ہے۔ ہر وقت نیا کپڑا، نیا زیور اس کی دھن لگی رہتی ہے۔آجکل لوگ زیادہ فضول چیزوں کے درپے ہیں۔عورتوں کی یہ حالت ہے کہ جو چیز ان کے سامنے سے گزرتی ہے، فوراً اس پر ان کی رال ٹپکنے لگتی ہے۔ایک عورت نے خود اقرار کیا کہ ہم تو جہنم جیسے ہیں جیسے اس کا پیٹ نہ بھرے گا اور ھل من مزید (کیا اور زائد ہے) کہتا رہے گا۔ایسے ہی ہمارا پیٹ ہے (دنیاوی چیزوں سے) نہیں بھرتا۔عورتوں کو زیور اور کپڑے اور خانگی (گھریلوں) سامان سے محبت زیادہ ہوتی ہے کہ رنگ برنگ کپڑے ہو، قسما قسم کے برتن ہوں، مختلف قسم کے زیور ہوں۔ (اصلاحِ خواتین از مولانا اشرف علی تھانوی ؒ ص ۱۱۴، ۱۱۵)

(جاری ہے)

☆☆☆☆☆☆☆

(صفحہ ۵۵ سے آگے)

کیا یہود و نصاریٰ اس کی حفاظت کریں گے؟ یا ہندو، مجوس اس کی حفاظت کریں گے۔جب اپنے سامان کی مالک ہی حفاظت نہ کرے تو اور کون کرے گا؟ الغرض بچوں کی تعلیم کی ابتداء نماز سے کی جائے اور اس کو عادت ثانیہ بنایا جائے۔ جب بچہ دس برس کا ہو جائے اور نماز نہ پڑھے تو اس کو مارو پیٹو۔غرض بچپن ہی میں نماز کا طریقہ سکھاؤ۔

۵۔ جب بچہ سیانا ہو جائے اس کو علم دین پڑھائیں، قرآن پڑھائیں۔اگر قرآن شریف پورا نہ ہو تو ایک ہی منزل پڑھا دی جائے۔آخر کی طرف سے پڑھا دیں۔اس کی چھوٹی چھوٹی سورتیں نماز میں کام آئیں گی۔ نیز قرآن شریف کے پڑھنے میں ایک ایک حرف پر دس دس نیکیاں ملتی ہیں۔ (العاقلات الغافلات)